ان اللہ لطیف خبیر
اللطیف
دار العلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب ویلور

اللطیف

زیر ظلِ حمایت و سرپرستی

اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین

سیّد شاہ محمّد باقر صاحب قبلہ قادری مد ظلہ العالی

سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز

مدیر اعلیٰ

حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین

سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری دامت برکاتہم العالی بی اے

ناظم دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز

نمائندگان طلبا :-

مولوی سید شبیر احمد بلمنیری
سکریٹری انجمن دائرۃ المعارف

مولوی کے ایس محمد صبغۃ اللہ کنجیوری
جنرل مانیٹر دار العلوم لطیفیہ

حافظ محمد کمال الدین بلنجیوری
سکریٹری صحت و صفائی

کے یم۔ شاکر اللہ مدنپلوی
جنرل کیپٹن دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ

مدیر مسئول:

مولوی سید مصطفیٰ حسین بخاری لطیفی کڈپوی اے پی

لکچرار دار العلوم لطیفیہ و جنرل سکریٹری انجمن دائرۃ المعارف

دار العلوم لطیفیہ

سنہ ۱۳۹۰ھ

۱۹۷۰ء

الیکٹرک قومی پریس بنگلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامین

"دارالعلوم لطیفیہ کے بیرونی حصہ کا ایک دلکش منظر"

پلیٹ کش :- سید مرتضیٰ حسین جہانگیر لطیفی

نعت شریف
عطیہ از
حضرت مولانا ابو صالح
عماد الدین سید شاہ محمد ناصر صاحب
قبلہ قادری مدظلہ العالی
المعروف بہ
میراں پاشا صاحب
از قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت
رکن الدین سید شاہ ابو الحسن قربی قادری رحمۃ اللہ علیہ
ہے محمدؐ حبیب مولا کا — ہے ازل سوں قریب مولا کا
کُنہ اس کا نہیں کسے معلوم — او ہے سرِّ غریب مولا کا
افضل الانبیاء محمدؐ ہے — سب پو فضل عجیب مولا کا
قاف تا قاف سب مطیب ہے — اس سوں آتا ہے طیب مولا کا
دینِ مطلق کی دعوتِ حق میں — او ہے ہر جا مجیب مولا کا
دفع کرنے شرارۂ دوزخ — ہے او مفضل نقیب مولا کا
نہ کے آداب اس سوں سیکھ تمام — ہے او سرور ادیب مولا کا
رغبت اس کی متابعت کا کر — مصطفےٰ ہے رغیب مولا کا
گلشنِ وحی میں او افصح ہے — نغمہ زن عندلیب مولا کا
بوجھ اس سوں حساب رشتے کا
او ہے قربی حبیب مولا کا

رباعی
کیونکر نہ کہوں قابلِ تعریف ہوں میں
سر سے پاتک عجب تالیف ہوں میں
ممکن نہیں تفسیر میری صورت کی
اللہ اللہ کس کی تصنیف ہوں میں
حضرت امجد حیدرآبادی

۹۶،
۹۲

الحمد للہ، اللطیف کا دسواں شمارہ ایک حسین گلدستہ کا روپ لئے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی تزئین و آرائش اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہمارے طلباء اور اساتذہ نے انتہائی جد و جہد اور جانفشانی سے کام لیا۔ اس میں آپ کو ہر قسم کے پھول اور بیل بوٹے ملینگے، یقیناً ان پھولوں سے اُٹھتی ہوئی مہک آپ کے مشامِ جان کو معطر کردیگی۔

اس گمراہ کن لٹریچر کے دور میں ضروری ہے کہ عوام الناس کو وقتاً فوقتاً سیدھی راہ اور صحیح عقائد سے روشناس کرایا جاتا رہے، تاکہ وہ غلط روِش اور فاسد عقائد کا شکار ہو کر اپنی عاقبت کو تباہ و برباد نہ کرلیں۔ اسی لئے ہر سال ہم اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات جو آج کے مسلمانوں کے لئے ضروری ہیں شائع کئے جائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاریاں صبحِ ازل سے جاری ہیں کبھی ان فتنوں نے ابوجہل اور ابولہب کا روپ دھارا تو کبھی آج دہریت کا جامہ اوڑھ کر سامنے آئے۔

لیکن اس وقت دنیائے اسلام میں ایک عظیم فتنہ سر اٹھا رہا ہے، وہ ہے انکارِ حدیث، ہمارا ایک نوجوان طبقہ اس کی ملمع سازیوں، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی جھوٹی چمک اور زہر آلود میٹھی تحریروں پہ اپنے سرمایۂ ایمان کو برباد کر رہا ہے۔ یہ فتنہ قرن اول میں معتزلہ اور خوارج کی صورت میں اٹھا تھا اور آج اہلِ قرآن کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔

اسی نشست میں ایک اور بات ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تصوف ایک منافی چیز ہے، جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اس میں دوسرے مذاہب کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اور وہ بے دھڑک محمد ابن عربی قدس سرہٗ پہ جنہوں نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا تھا، اعتراضات کر بیٹھتے ہیں لیکن ہم بیانگِ

اعلان کرتے ہیں کہ تصوف دین سے الگ کوئی چیز نہیں۔ یہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے دور میں موجود تھا۔ مگر اس وقت اس کے لئے کوئی الگ نام اور علیحدہ صورت نہیں تھی۔ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہٗ نے تصوف کے متعلق ارشاد فرمایا :-

ھٰذا علمنا مشیّدٌ بالکتاب والسنّۃ یعنی یہ ہمارا علم تصوف کتاب وسنت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ نے اپنی گراں مایہ تالیف جواہر السلوک میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ھمعات کی عبارت، جو سالک سے متعلق ہے نقل فرمائی ہے جس کا ترجمہ ہے:-

پہلی چیز جو سالک کے لئے ضروری ہے وہ صحابہ وتابعین اور تمام سلف صالحین کے نہج پر عقائد کی تصحیح ہے اور اس کے ساتھ ارکان اسلام کا ادا کرنا کبیرہ گناہوں سے بچنا اور مظالم سے رکنا ہے علاوہ ازیں وہ تمام چیزیں اختیار کرنا جس کا شریعت غرّہ نے حکم دیا ہے۔

امتداد زمانہ کے ساتھ علم تصوف بھی ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ اس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرلی۔ ہر فن کے سمجھنے کے لئے اس کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے* کہ تصور، تصدیق۔ جنس۔ نوع فصل وغیرہ۔ اسی طرح فلسفہ کے لئے ہیولہ، صورت نوعیہ۔ جوہر، جسم وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر منطق اور فلسفہ کی کتاب سمجھنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسی طرح فن تصوف کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسکی اصطلاحات، جیسے احدیت۔ وحدت۔ واحدیت حقیقیہ، محمدیہ۔ وحدت الوجود وغیرہ، پر عبور حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد بغیر کسی تعصب کے خالی الذہن ہوکر تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو یقیناً اسکی حقیقی لذتوں سے آشنا ہوکر سر دھننے پر مجبور ہو جائیں گے۔

خدا کا فضل ہے کہ ہمارا یہ **دار العلوم لطیفیہ** قوم کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت میں ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شب وروز مشغول عمل ہے۔

اللھم اھدنا الحق والصواب
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

---

* مثلاً منطق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ

دارالعلوم لطیفیہ کے اندرونی حصہ کا ایک حسین نظارہ

بشکریہ:- سید مرتضیٰ حسین جہانگیر لطیفی ویلوری

شاہانِ اسلام کی سرپرستی نے مدارس اسلامیہ کو ہندوستان میں بہت کچھ پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کے مواقع عطا کئے۔ ہندوستان کے اکثر وبیشتر شہروں میں اسلامی کالجیں اور یونیورسٹیاں پھیل گئیں۔ جہاں سے لوگ بلا تفریق مذہب ملت سیراب ہوتے رہے۔ اس کے بعد ایک ایسا ہولناک اور وحشت انگیز دور آیا، کہ انکی حالت انتہائی خراب اور نازک ہوگئی۔ تباہ کن آندھیوں نے انکی بنیادوں کو ہلا دیا۔ ہلاکت خیز طوفانوں میں وہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ مدارس کا مخزن جونپور، جہاں کبھی سینکڑوں مدارس سرگرم عمل تھے داستانِ پارینہ بن گیا۔ کم وبیش یہی حالت دہلی لکھنؤ وغیرہ کی ہوئی۔ اسلامی قلعوں کی اس عظیم تباہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف مخالف سرکش طاقتوں اور طاغوتی قوتوں نے سر اٹھایا مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرنے پر آمادہ ہوگئیں تو دوسری طرف لوگ آنکھوں کو خیرہ کردینے والی مغربی تہذیب کے پیچھے دیوانہ وار دوڑنے لگے۔

قوم کی اس مخدوش و ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لیتے ہوئے ملک کے دونو بازو جنوب شمال حرکت میں آگئے۔ قدوۃ السالکین شمس العلماء مولانا مولوی الحاج اعلیحضرت رکن الدین سید شاہ محمد قادری سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز نے جنوب میں اپنے جد اعلیٰ کے قائم کردہ مدرسہ کو ۱۳۰۲ھ میں تشکیل نو دے کر انسانیت کی تعمیر میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ جہاں سے سینکڑوں تشنگانِ علوم سیراب ہو کر اپنی لازوال خدمات سے جنوب کی بیخ بستہ زمین کو لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں سے بدل دیا۔

جنوبی ہندوستان کی یہ عظیم دینی درسگاہ جس کو بجا طور پر **"اھم المدارس"** کا شرف حاصل ہے اپنی خصوصی روایات کے ساتھ برابر ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ موجودہ سرپرستوں نے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس کے نوک پلک کو اور کچھ سنوارا نکھارا۔

خدائے بزرگ و برتر دین کے اس عظیم الشان قلعے کو ہر آفت و مصیبت سے محفوظ رکھے۔ اور ملت کے نوجوان اس کی مقدس فصیلوں سے زمانہ کا حوصلہ آسمانوں کا سکوت اور چٹانوں کا عزم لیکر قوم کے سامنے آئیں اور اسکی رہنمائی کریں۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

سالِ نو

دارالعلوم کے تعلیمی سال کے شروع ہونے میں ابھی کچھ دن رہ گئے تھے، کہ طلباء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ درخواستوں کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ سالِ گذشتہ کی بہ نسبت اس سال داخلہ میں اور توسیع کردی گئی، تاکہ ملّت کے زیادہ سے زیادہ نونہال اس سرچشمۂ علوم و حکمت سے سیرابی حاصل کرسکیں۔

افتتاحی اجلاس

موٴرخہ ۱ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق ۸ فروری ۱۹۷۰ء

شب یکشنبہ ۹ بجے دارالعلوم کے وسیع و عریض ہال میں انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس بزیر صدارت عالیجناب عزت مآب اعلیحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمّد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ سجادہ نشین مکان حضرت قطبِ ویلور قدس سرہ العزیز، انعقاد پذیر ہوا۔

جلسہ کا آغاز حافظ محمد کمال الدین ملیچپوری کی قرأت سے ہوا۔ اس کے بعد حافظ محمد ابرہیم ادونی نے اپنی دلکش و سریلی آواز میں نعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سنائی۔ امسال مذکورہ اجلاس سے خطاب کرنے کے لئے الحاج ٹی۔ عبدالواحد صاحب B.A - BL., سابق ممبر پارلیمنٹ رئیس آمبور، کو مدعو کیا گیا جس میں عالی جناب مولانا مولوی مارکیار محمد حبیب اللہ صاحب اور علمدوست و علم پرور حضرات بھی شریک تھے۔

معزّز مہمان نے انجمن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرات میں نے مختلف پلاٹ فارم سے عوام کو خطاب کیا ہے اور ان کی رہنمائی کی لیکن آج کے اجلاس میں یہ انوکھا موقع میرے لئے انتہائی باعث برکت ہے۔ آپ نے طلبائے دارالعلوم کو اس مقدس سرزمین میں تعلیم حاصل کرنے پہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ جنوبی ہندوستان میں اسلامی کلچر اور تہذیب کو فروغ دینے والا یہی ایک واحد ادارہ ہے۔ بانیانِ دارالعلوم کی مقدس تعلیمات و جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی جنوب میں ہدایت کی شمعیں روشن ہیں۔ فاضل مقرر نے فن خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ عظیم فن ایسی بھرپور قوت کا مالک ہے کہ جسکے ذریعہ ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو ہمنوا بنایا جاسکتا ہے، آج سے سینکڑوں سال پیشتر عربوں کی اس فن میں کامل مہارت اور ان کے فصیح و بلیغ خطبات کا یہ اثر تھا کہ سینکڑوں انسان لمحہ بھر میں سر بکف میدانوں میں اتر آتے تھے۔ دورِ حاضرہ میں اس فن کی انتہائی ضرورت ہے جس سے آپ بآسانی اسلامی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ قوم کی ہدایت و رہنمائی آپ کے ذمہ ہے۔ انگریزی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء، دین سے ناواقف اور اسلامی تعلیمات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اگر آپ اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے تو خدائے تعالیٰ کے پاس جوابدہ ہونا پڑے گا۔ مجھے امید ہے

کہ آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے۔

آپکے بعد عالی جناب مولانا مولوی مدیکار محمد حبیب اللہ صاحب نے جلسۂ ھٰذا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے کہ ہم نے غیروں کی چیزوں کو نہیں اپنایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان علماء و صوفیاء نے ہندوستان میں رہکر یہاں کی مختلف چیزوں کو اختیار کیا۔ البیرونی اور ملا عبد القادر بدایونی نے غیر مذاہب کی کتابوں پر ریسرچ کی اور ان کی خوبیوں کو اپناتے ہوئے اپنے غیر متعصب ہونے کا ثبوت دیا بسلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے آپ نے طلباء کو نصیحت فرمائی کہ امام غزالی کو اپنا مطمح نظر بنائیں اور اپنی زندگی کو ان کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس سے آپ زمانے کا رُخ بدل سکتے ہیں۔

بعد ازاں عالیجناب مولانا حضرت ابو الحسن صدر الدین شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری مدظلہٗ B.A ناظم دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز نے اپنے مخصوص انداز فکر میں اہل جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جو رہتی دنیا تک یادگار زمانہ رہے۔ روزانہ دنیا میں لوگ حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور زندگی کا آخری سانس لیکر ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہی انسان قابل مبارکباد ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ فاضل مقررین کی پُر از معلومات تقاریر کی جانب طلبائے عزیز کی توجہ مبذول فرماتے ہوئے آپ نے کہا کہ خوبیاں اور اچھائیاں جہاں سے بھی حاصل ہوں اسکو اپنانا چاہیئے، یہی مومن کی شان ہے۔ آخر میں آپنے معزز مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا فرمایا۔

۱۱½ بجے صلوٰۃ و سلام پر یہ مجلس علمی اختتام پذیر ہوئی۔

انجمن دائرۃ المعارف کے جلسے

طلباء کو فن تقریر و خطابت کے میدان میں آگے بڑھانے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے انجمن کی جانب سے ہفتہ میں دو اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ایک شب جمعہ جسکی صدارت دار العلوم کے اساتذۂ کرام فرماتے ہیں۔ دوسرا صبح جمعہ جسکی صدارت منتہی طلباء کے ذمہ ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ عالیجناب حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی ناظم دار العلوم و صدر انجمن ھٰذا جلسہ کی صدارت فرماتے ہیں جس میں آپ خود طلباء کے لئے کسی عنوان کا انتخاب کرتے ہوئے اسکی تائید و تردید پر تقریر کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح طلباء میں اپنی تقریری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور اس میں ملکہ حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔

انجمن کے مخصوص اور اہم جلسے

۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ

کو سید الشہداء سیدنا امام حسین علیہ السلام کی سیرت مقدسہ پر جناب مولانا سید انوار اللہ صاحب اور جناب مولانا سید مصطفےٰ حسین بخاری صاحب نے بارگاہ حسینی میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں آپ کی سیرت مبارکہ کے اہم گوشوں کو واضح فرمایا۔

۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ بروز دوشنبہ جلسۂ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ۱۰ ربیع الثانی بروز دوشنبہ جلسۂ سیرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ منعقد ہوئے جس میں طلبائے عزیز، اساتذۂ کرام اور حضرت ناظم مدظلہ العالی نے اپنی بصیرت افروز تقاریر سے بارگاہ رسالت صلعم و غوثیت ؓ میں نذرانۂ عقیدت پیش فرمایا۔ مذکورۃ الصدر جلسے بزیر صدارت فخر ملت عزت مآب اعلیحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز انعقاد پذیر ہوئے۔

۱۵ اگسٹ کو یوم آزادی کے موقعہ پر اساتذۂ دارالعلوم و حضرت ناظم صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے ملک کی آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اسباب صحت

انسان پر کچھ اس کے بدن کے حقوق بھی ہیں ان لبدنك عليك حقاً۔ لیکن اس کے لئے حدود ضرور قائم ہیں۔ انسان ان حدود سے تجاوز نہ کرے صحت کے لئے ورزش کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔ جہاں صحت باقی نہ رہی، طبیعت میں کسلان، سستی، بےبسی، اسی قسم کے مختلف عارضے لاحق ہو جاتے ہیں۔ دماغ کی ساری پھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ پڑھنے میں دل لگتا ہے اور نہ اسباق یاد ہوتے ہیں۔ ان چیزوں سے بچنے کے لئے کھیل ضرور چاہئے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

واجبات الدرس لا ننکرها	ابدا بل دائما نذکرها
ان لعبنا لم نکن نحقرها	غیر ان الوقت ذا اللعب
انما اللعب بلا درس حرام	وکذا الدرس بغیر اللعب

اسی لئے دارالعلوم میں والی بال، بیٹ منٹن، ٹنی کائٹ، کبڈی جیسے بہترین کھیلوں کا انتظام ہے عصر و مغرب کے درمیان طلباء مختلف گیمس میں حصہ لیتے ہوئے اپنی دن بھر کی تھکان مٹاتے ہیں اور پیمٹر گستی سے بچتے ہوئے بعد نماز مغرب تازہ دم ہو کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

درسیات

دارالعلوم کا نصاب سلسلۂ درس نظامیہ سے متعلق ہے۔ لیکن اس میں کچھ ہلکی سی ترمیم کی گئی تاکہ طلباء کو جدید ادب اور اسلامی تاریخ سے واقفیت ہو۔ ہر زمرہ کے لئے تاریخ کو لازمی قرار دیا گیا اور ادب عربی کی جدید کتابیں متوسطات میں داخل کر لی گئیں۔

نصابِ عالم

یہ دو سالہ کورس ہے۔ پہلے سال تفسیر جلالین، مشکوٰۃ المصابیح، شرح عقائد نسفی، ہدایہ اولین (فقہ حنفی) یا محلی (فقہ شافعی) ملاحسن، دیوان حافظ، تاریخ اسلام۔ دوسرے سال :۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع الترمذی، تفسیر مدارک، ہدایہ آخرین (فقہ حنفی) یا محلی جلد ثانی (فقہ شافعی) سراجی، تاریخ اسلام اور مثنوی مولانا رومؒ داخل درس ہیں۔

نصابِ فاضل

یہ بھی دو سالہ نصاب ہے۔ پہلے سال :۔

تفسیر بیضاوی۔ شرح معانی الآثار (طحاوی)، مسلم الثبوت، حماسہ، ملاجلال، میر زاہد، میبذی تاریخ اسلام اور جاوید نامہ۔

دوسرے سال :۔ فصوص الحکم، جواہر الحقائق جواہر السلوک، تحفہ مرسلہ، احیاء العلوم، حجۃ اللہ البالغہ ابن ماجہ، معجز مصطفائی پڑھائی جاتی ہیں۔

شعبۂ حفظ

تملناڈ۔ آندھرا پردیش، اور ریاست میسور وغیرہ کے کئی طلباء شعبۂ حفظ سے فارغ ہو چکے ہیں جن کا اسٹینڈرڈ امتیازی شان کا مالک ہے۔ اس کے ساتھ دارالعلوم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس شعبہ میں فارغ ہونے والے طلباء کو عبا و سند کے علاوہ قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دیجاتی ہے جو متصلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے۔

ایڈیٹوریل بورڈ

اس کے قیام کا مقصد طلباء کی تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ہر طالب علم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سالنامہ "اللطیف" میں اس کا مضمون شائع ہو۔ لیکن بورڈ صرف ان مضامین کو اشاعت کی اجازت دیتا ہے جو معیاری ہوں۔ اور غیر معیاری مضامین نگار کی بورڈ رہنمائی کرتے ہوئے اس کے اسلوب اور قواعد وضوابط کی طرف نشان دہی کرتا ہے تاکہ وہ آنے والے سال تک اپنے مضامین کو قابلِ اشاعت بنا سکیں۔

دار التصنیف والاشاعت

یہ ادارہ شب و روز تحقیق و ریسرچ میں مشغول ہے۔ اب تک اس ادارہ کی جانب سے بزرگان مکان کی تاریخ اور کئی تبرکات ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً :۔

انوار اقطاب ویلور۔ رسالہ بیعت غائب و حاضر میزان العقائد۔ مجموعۂ رسائل قربی انشاء عقائد ذوقی۔ وغیرہ

انشاءاللہ تعالیٰ عنقریب قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ مولانا مولوی محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری المشہور بہ حضرت قطب ویلور

قدس سرہ العزیز کی تالیف نیف "جواہر السلوک" دنیائے
تصوف کا عظیم شاہکار جو آپ اپنی مثال ہے مع ترجمہ
کے پورے آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پہ آرہی ہے۔

دار الافتاء

دار العلوم کے منتخب
اساتذۂ کرام اعلیٰ
حضرت قبلہ مدظلہ العالی
کی سرپرستی و نگرانی میں مختلف مقامات سے آنے والے
استفتاء کے جوابات قرآن و حدیث اور فقہائے کرام کے
اقوال کی روشنی میں انتہائی تحقیق و تدقیق سے مرتب
فرماتے ہیں۔

دار الاخبار

مختلف جرائد و رسائل کے علاوہ
ملک کے مشہور ادبی، مذہبی
اور تاریخی ڈائجسٹ طلباء کے مطالعہ کے لئے فراہم
کئے جاتے ہیں تاکہ طلباء ملک کے اندرونی اور بیرونی
حالات سے غافل نہ رہیں۔ زمانے کے بدلتے ہوئے
حالات پر ان کی نظر ہو۔ پھر اپنی تاریخی اور مذھبی
معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اپنے ادب کو فروغ دیں۔

نوید مسرت

جب سے دار العلوم کا الحاق
مدراس یونیورسٹی سے ہوا ہے،
طلباء ہر سال افضل العلماء، منشی فاضل
اور ادیب فاضل کے امتحانات میں برابر شریک ہو
رہے ہیں اور نتیجہ بھی ہر سال شاندار نکل رہا ہے۔
اس سال افضل العلماء۔ منشی فاضل،
ادیب فاضل کے امتحانات میں شریک ہونے والے
اکثر و بیشتر طلباء نے مدراس یونیورسٹی میں درجۂ
اوّل و دوم سے کامیابی حاصل کی۔ خصوصًا
افضل العلماء، منشی فاضل اور ادیب
فاضل فائنل میں تمام درجۂ اول سے کامیاب ہوئے
الحمد للہ علےٰ ذالک

اسطرح دار العلوم نے انکی دینی ترقی کے ساتھ
دنیوی ترقی کی راہیں بھی کھول دی ہیں جس سے وہ
انشاء اللہ تعالیٰ اپنا مستقبل روشن اور تابناک بنا سکتے ہیں۔

امتحانات و انعامات

دار العلوم میں ہر
سال تین امتحان
ہوتے ہیں۔ سہ ماہی ششماہی اور سالانہ۔
سہ ماہی اور ششماہی امتحان اساتذۂ دار العلوم
لیتے ہیں لیکن سالانہ امتحان کے پرچے بیرونی علمائے کرام
تیار کرتے ہیں۔ اسوقت امتحان ہال کی نگرانی کے لئے بیرونی
حضرات کا انتخاب کیا جاتا ہے اور جوابات کی کاپیاں
جانچنے کے لئے باہر ہی بھیجدی جاتی ہیں۔
شعبۂ حفظ کے لئے بھی باہر ہی سے ممتحن
کو بلایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس سال بھی طلباء کے
امتحانات اسٹرکٹ طور پر لئے گئے۔ درسیاتِ
تجوید، مقالہ نویسی اور سپورٹس میں اول و دوم
آنے والے طلبہ کو بیش قیمت انعامات سے نوازا
گیا۔

دستار بندی اور تقسیمِ اسناد و عبا

امسال درجہ مولوی عالم میں فارغ شدہ طلباء کو عبا اور سندِ عالم اور مولوی فاضل میں فارغ ہونے والے کو عبا، دستار اور سندِ فاضل عطا کی گئی۔

ہدیۂ تشکر

ہم ان اطباء اور ڈاکٹروں کے تہِ دل سے مشکور ہیں، جنہوں نے موسمی اثرات سے متاثر ہونے والے طلباء کی جانب فوری توجہ دیتے ہوئے ان کی صحت کو بحال کرنے کی کوشش فرمائی اور ہمیشہ خندہ روئی سے پیش آتے رہے۔

نیز ہم اُن مدیرانِ اخبار و مالکانِ مطابع کے بھی انتہائی مشکور ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی کارروائیوں کو وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے — خصوصاً جناب مولوی عبدالمتین صاحب مالک الیکٹرک قومی پریس بنگلور ۲ اور جناب سید فضل اللہ صاحب مالک روزنامہ اخبار "مسلمان" و ہمدرد پریس اندرونِ عزیزیہ بازار مدراس آپ حضرات نے ہماری مطلوب ضروریات کی اشاعت کو مقدم کرتے ہوئے ہمیشہ ہماری ہمت افزائی کی۔ خدائے بزرگ و برتر آپ تمام اور دارالعلوم سے قلبی لگاؤ رکھنے والوں کو سعادتِ دارین سے بہرہ ور فرمائے۔

آمین۔ بجاہ سید المرسلین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوز و گداز

از عالیجناب
حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین
سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری
B.A مدظلہ العالی
ناظم دار العلوم لطیفیہ

برطانیہ میں جبکہ گلاڈسٹن کی وزارت کا شہرہ تھا ۱۸۸۲ء میں مصر پر برطانیہ کا قبضۂ تصرف ہوگیا۔ گلاڈسٹن کی فراست، اور دُور رس نظریں وہ کام کر رہی تھیں جو اُس وقت اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اَمر یقینًا لازمی تھا کہ اُنہیں اپنی حکومت کا اقتدار بحال رکھنے کے لئے بیشتر منصوبے بنائیں اور بہت سی تجویزیں سوچیں۔ افضل اور مقدم فیصلہ یہ رہا کہ وہاں کے مسلمانوں کو بے دین کر دیا جائے۔ چنانچہ گلاڈسٹن وزیرِ اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ کے سامنے ایک روز مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید کو اپنے ہاتھ میں لیکر گھماتے ہوئے کہا کہ جب تک یہ کتاب وہاں کے مسلمانوں کے سینوں میں ہوگی اس وقت تک ہماری حکومت مستحکم نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اس کو زینتِ طاق بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔ اس کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی حکمتِ عَملی سے کام لینا شروع کیا۔

برطانیہ اُس وقت بڑے نازک دَور سے گذر رہا تھا۔ ایک طرف مذہب یعنے چرچ، اور دوسری طرف سائنس دانوں میں باہم اختلاف اور تصادم ہو رہا تھا۔ چرچ سائنس کی ترقی کو شیطانی عمل تصوّر کرتے ہوئے اسکی حیرت انگیز ایجادات کو برداشت نہ کرنی تھی۔ چنانچہ ان پر مختلف الزامات عائد کرتے ہوئے بیحد مظالم ڈھانا شروع کیا اور اپنی ستم ظریفیوں کا شکار بنانے لگی۔

سائنس دانوں نے بھی مذہب یعنی چرچ کے خلاف ایک زبردست مہم قائم کی اور مذہب کی تنگ نظری اور تنگ دلی کے ترانے گانے لگے۔ وہاں کے اخباروں میں یہی چرچا تھا اور رسالے انہیں حملوں سے بھرپور تھے۔ فضا مکدّر اور گندی ہونے لگی۔ ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوششیں جاری و ساری تھیں اور سوسائٹی اس قسم کے مخمصوں میں مُبتلا ہو چکی تھی۔

اِس دَورِ پُر فتن میں گلاڈسٹن کی پالیسی حرکت میں آگئی۔ اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کے اخبارات، میگزین و رسالے، و

دیگر ہمہ قسم کا گندہ اور مذہب کے خلاف لٹریچر برطانیہ سے مصر میں بھیجا گیا۔ انگریزی طرز کی اسکول کھولی گئیں۔ نصاب تعلیم تبدیل کیا گیا۔ دینیات ہٹا دی گئی، اور مسلمان بچوں کو مذہب اسلام سے بیگانہ کرنے میں کوئی فروگذاشت نہ کی، اور مسلمانوں کی آنے والی نسلیں ان سازشوں کا شکار ہونے لگیں، اور مغربی طرز عمل کی دلدادہ ہو گئی۔" اسلام دی مس انڈرسٹوڈ ریلیجن" ——— "ISLAM THE MIS-UNDERSTOOD RELIGION" سے صاف ظاہر ہے کہ مصر میں موجودہ زمانے کے اکثر مسلمان دین اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بھی جہلا میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سائنس کی اس ترقی کے زمانے میں مذہب ایک دقیانوسی چیز ہے۔ مذہب سے انہیں کچھ لگاؤ، اگر ہوتا تو اس کی شیرینی اور لذت سے وہ ضرور محظوظ ہوتے۔ انگریزوں نے اپنی پیہم کوششوں سے سعی بلیغ میں کامیابی حاصل کر لی۔

مذہب کی ضرورت لازمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان بے نکیل ہو کر وحشی جانور نہ بن جائے، اس لئے اللہ جل شانہ نے بگڑی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم پہ گامزن کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعے نورِ ہدایت بہم پہنچاتا رہا۔ اور اسلام کے ذریعہ انسانیت کی تربیت مکمل فرمائی۔ معاشرہ کو بہتر نظام عطا ہوا۔ عورت کا مقام بلند کیا گیا۔ مرد اور عورت میں وراثت کی تقسیم عمدہ پیرائے پر عمل میں آئی اور ایک دوسرے کے حقوق واضح کئے گئے۔ جہاں قرآن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی معاشی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی زندگی کے امور بہ نفس نفیس بیان فرمایا، وہاں ان کی روحانی تربیت کیلئے شریعت و طریقت، حقیقۃ و معرفت کے راز ظاہر کئے۔

اسلام میں خصوصاً علم کے حاصل کرنے پر بیحد زور دیا گیا ہے۔ سائنس کا علم بھی ممنوع نہیں ہے۔ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے حیرت انگیز ایجادات کی ہیں۔ جہازرانی و جہازسازی، زمین کی پیمائش کرنا۔ علم حساب میں اَلجبرا کا ایجاد کرنا۔ فلسفہ کی بنیاد ڈالنا۔ کئی ایک لائبریریاں اور یونیورسٹیوں کا قائم کرنا۔ ستاروں کا علم معلوم کرنا، یہ تمام اور دیگر بہت سی ایجادات جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کی فتوحات میں شامل ہیں۔ لہٰذا علم سائنس کے ذریعہ چاند سورج اور ستاروں کے راز فراہم کرنا اور ان کی بلندیوں پر پرواز کرنا اسلامی دائرۂ عمل میں رہ کر جائز ہے، جہاں اللہ نے عقل سلیم عطا کی اور بندے کو تمام اشیاء پہ قادر بنایا ہے وہاں ان کو عمل صالح سے دنیا و آخرت بہتر بنانے کی ہدایت بھی کی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو چار سال و چار مہینے گذرنے کے بعد ان کی رسم مکتب یعنی بسم اللہ خوانی کرتے ہیں۔ بادشاہوں سے لیکر غریب مسلمانوں میں بھی یہ رسم ہوا کرتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے بچوں کو پہلے قرآن کی تعلیم دیتے ہیں، بعد ازاں دیگر علوم و فنون سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ ہمارے اس دیس میں سیکولرزم کے ذریعہ لادینیت شروع ہو گئی ہے۔

اسکولوں سے مذہبی تعلیم ہٹا دی گئی۔ بچوں کو جو پہلے دینی تعلیم دی جاتی تھی وہ اب ختم کر دی گئی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں مسلمان لڑکا اسکول اور کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کیا وہاں اپنے دین و مذہب کی تعلیم سے بے بہرہ ہو گیا۔ ارکان اسلام و فرائض نماز سے بھی نابلد ہو گیا۔ ان کا کیا کہنا کہ جو لوگ اپنے بچوں کو کسی بھی قسم کی تعلیم نہیں دیتے وہ اصل جہلا میں شمار کئے جائیں گے۔ لادینیت پھیلتی جا رہی ہے۔ لوگ شرک و بدعت میں مبتلا ہونے لگے ہیں، جائز و ناجائز، حلال و حرام میں کوئی فرق و تمیز باقی نہیں رہی ہے۔

"محمڈانزم" Mohammedanism میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب H. A. R. Gibb رقمطراز ہے کہ ہندوستان کے اکثر دیہات میں مسلمان ہندو میلوں میں شریک ہوتے ہیں اور اُن کے بتوں کی پوجا کرتے ہوئے ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ مردوں کے علاوہ کثیر تعداد میں عورتیں شیخ سدّو کی پرستش، کرتی ہیں۔ اور اپنی حاجتیں پورا ہونے کی توقع رکھتی ہیں۔ لاعلمی اور مذہب سے ناواقفیت کے باعث شرک میں مبتلا ہیں۔

اس موقع پر ناظرین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے نور ایمانی کی ایک جھلک واضح کی گئی تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

فتح مکّہ سے پیشتر جب ابوسفیان مدینہ منورہ گیا تو سب سے پہلے اپنی بیٹی حبیبہؓ کے درِ دولت پر گیا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیٹی نے دروازہ کھولا۔ باپ کو کھڑے پایا، اندر بلایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر بچھا تھا۔ اس پر بیٹھنا چاہا۔ بیٹی نے جھٹ سے بستر لپیٹ کر رکھدیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابوسفیان بیٹھنے کو تو بیٹھ گیا، مگر حیران تھا کہ بیٹی نے بستر لپیٹ کر کیوں رکھ لیا۔ آخر پوچھا "بیٹی! تم نے بستر کیوں لپیٹ لیا؟ کیا بستر مجھ سے بہتر تھا؟"

"ابّا جان! بستر بہتر تھا۔ تم نہیں جانتے یہ بستر حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ خدا کے نبی کا ہے۔ میرے اور تمام مسلمانوں کے آقا و مولا کا ہے"۔

"میں بھی تو قریش کا سردار ہوں"۔

"آپ بیشک قریش کے سردار ہیں۔ مگر مشرک ہیں، اور مشرک نجس ہوتا ہے۔ مجھے ایک مشرک کو آنحضرت کے بستر پر بٹھاتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

"تو، کیا میں نجس ہوں؟"

"یقیناً اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے؟"

"مجھ سے جدا ہونے کے بعد تجھ میں کیسی باتیں پیدا ہو گئی ہیں"؟

"جب دل میں نور کی روشنی آجاتی ہے، تو تاریکی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے"۔

بعد ازاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر ابوسفیان مشرف بہ اسلام ہو گئے اور کلمۂ طیب لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا۔

نورِ ایمانی پیدا کرنے اور اس کی تازگی سدا قائم رکھنے کے لئے اولاً یہ ضروری ہے، کہ مسلمان اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ اس کے بعد دیگر علوم وفنون سے بہرہ ور کریں۔

وہ بدنصیب لوگ جو ہر قسم کی تعلیم سے اپنے بچوں کو محروم رکھتے ہیں اُن کے لئے لازم ہے کہ کم از کم انہیں قرآن کی تعلیم سے مزین کریں۔

دینی تعلیم حاصل کرنے کے ادارے محدود ہیں۔ لیکن ہر ایک کے لئے ان اداروں میں گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مذہبی تعلیم عام کرنے اور تمام تر سہولتیں بہم پہنچانے کا واحد اور موزوں حل عمل میں لایا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ ہر محلہ کی مسجد میں اس تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ جہاں پہلے سے نہیں ہے۔

اس طرح ہر دیہات اور شہر کے ہر محلہ میں تعلیم جاری ہو جائے گی۔ اساتذہ کے علیحدہ انتظام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پیش امام ہی کو اس کام پر مامور کرتے ہوئے ان کی تنخواہ میں کچھ اضافہ کر دیا جائے تو یہ کام بآسانی انجام پائے گا۔ یہ نظام عمل عمدہ پیرائے پر چلے گا۔ اور تشنہ قوم کے نونہال سیراب ہو سکیں گے۔ جہالت کی تاریکی مٹانے اور گھر گھر میں علم کی روشنی پھیلانے میں کافی مدد ملیگی۔

اللہ کرے کہ پھر سے مسلمانوں میں وہی بیداری اور جذبۂ تعلیم قرآنی پیدا ہو جائے۔

آمین۔ ثم آمین۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز آفتاب علم و ھدایت بن کر افق عالم پر ۱۴؍ جمادی الثانی ۱۲۰۷ھ ہجری کو جلوہ گر ہوئے۔ آپؒ کی عرفانی، علمی، ادبی اور اصلاحی خدمات اہل عرب و عجم میں آفتاب درخشاں ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ دینی و علمی خدمات میں صرف کیا اور مختلف فنون کے اندر خصوصًا فن تصوف میں بلند پایہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ میں دینی خدمات کے علاوہ اور کوئی جذبہ موجزن نہ رہا۔ اشاعت اسلام کی خاطر آپ نے مقامات مختلفہ مثلاً راجستان، مالابار، میواڑ کے راجہ مہاراجوں کو خصوصًا شہنشاہ انگلستان ملکہ وکٹوریہ کو عربی کے ماسوا مختلف زبانوں میں دعوت اسلام کے خطوط روانہ کئے۔ ملکہ وکٹوریہ نے آپ کے دعوت نامہ کو ملاحظہ کیا، اور بے حد خوش ہوی۔ جواب میں لکھا کہ یہ شہزادی جو سلطنت برطانیہ کی فرماں روا ہے نہ صرف آپکی بے باکی و حق گوئی کی داد دیتی ہے بلکہ اس دعوت نامہ کی دل سے احترام و قدر کرتی ہے۔ میں مانتی اور جانتی ہوں کہ اسلام حقانیت اور روحانیت وصداقت کا مجموعہ اور نجات اُخروی کا بہترین ذریعہ ہے مگر مجھے قبول اسلام کی راہ میں چند مجبوریاں سد باب ہیں۔ وکٹوریہ نے اس خوشی کے صلہ میں حضرت قطب ویلورؒ کی خدمت عالی میں بطور وظیفہ ایک سو روپے پیشکش کی۔ مگر آپ نے اس پیشکش کو شکریہ کے ساتھ واپس فرما دیا اور لکھ بھیجا کہ فقیر کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے اور یہ فقیر اس وقت خوش ہوتا جبکہ آپ مشرف بہ اسلام ہوتیں۔

حضرت قطب ویلورؒ کے دست حق پرست پر تقریبًا سات لاکھ انسانوں نے بیعت سے مشرف ہو کر منزل مقصود کو پایا۔ آپ ہی کی وہ ذات قدسی ہے جن کو مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر سلام کرنے سے وعلیک السلام یا ولدی کا جواب مستطاب آیا۔

آپ کی تحقیق سے عقل حیران و دنگ ہے کہ اتنے مختصر سے عرصے میں آپ نے کیسے کیسے دقیق و دشوار ترین مسائل کو نہایت ہی سہل و سلیس طریقے پر شستہ

زبان میں حل فرمایا۔

ضمیمۂ جواہر السلوک میں مرقوم ہے کہ "آں حضرت تصانیف عجیب دارد کہ بر کمالِ وے فی الجملہ دال بود"۔

آپکی تصانیف کردہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱) احیاء التوحید ۲) احیاء السنّۃ
۳) تنبیہ الجاہلین ۴) صراط المومنین
۵) مکتوبات لطیفی ۶) رسالہ بذکر الف مقام
۷) جواہر الحقائق ۸) فصل الخطاب فی الفرق بین الخطاء والصواب
۹) غایۃ التحقیق
۱۰) جواھر السلوک ۱۱) رسالہ قطرہ
۱۲) اصل العلوم

آپ کی نایاب و نادر کتابوں میں خصوصًا جواہر الحقائق، فصل الخطاب، غایۃ التحقیق، جواہر السلوک علمی و عرفانی دنیا میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جواہر الحقائق، جو ۱۲۷۳ھ کو مدراس میں طبع ہو چکی اور دار العلوم لطیفیہ کے نصاب میں شامل ہے کتاب کیا ہے؟ صحیح اندازہ پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ حقائق و معارف و دقائق و اسرار کا موجیں مارتا ہوا ایک بحرِ بیکراں ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ آپ کی یہ تصنیف لطیف تصوف میں ایک سنہرے باب کے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ راہِ عرفان کے ایک صادق متلاشی کو اس کا مطالعہ دوسرے کتبِ تصوف سے مستغنی کر دیتا ہے۔

غایۃ التحقیق تحفۂ اثنا عشرہ سے مشہور ہے اور یہ ۱۲۷۸ھ کو شہر مدراس میں طبع ہوئی ہے، یہ کتاب ایک پیارم پیٹی صاحب کے سوال پر بصورت جواب لکھی گئی۔ اس میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق آج جو قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور عوام کے اذہان میں جو غلط سلط مقدمات ترتیب پا گئے ہیں ان سارے اعتراضات کا جواب غایۃ التحقیق میں دیا گیا ہے۔ اگر معترضین وحدت الوجود وسعت النظری کے ساتھ عمیق مطالعہ کریں تو حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

بعض علمائے عصر نے جب حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز کے متعلق لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلائیں اور آپ کے عقائد پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سنّی گروہ میں اختلافات کی رسہ کشی بڑھ گئی اور یہ بدعات کے غار میں تیزی سے بڑھنے لگے اور ہر کس و ناکس کتاب و سنت سے احکام کا مجتہدانہ استنباط کرنا شروع کیا اور اسی طرح مقلد بعض فقہائے کرام کے مذہب کو دوسروں پر فوقیت دینے لگے۔ اہلسنت جماعت کے شدید اختلافات سے و شریعت کے ظاہری و باطنی احکام سے اختلافات کی بنا پر آپس میں تضلیل و تکفیر کی بوچھار ہونے لگی۔ ان جمیع وجوہات کی بنا پر حضرت قطب ویلور نے ایک بلند پایہ کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نام فصل الخطاب فی الفرق بین الخطاء والصواب

رکھا۔ یہ ۱۲۷۷ھ کو مدراس میں طبع ہوئی۔ آپ نے ہر مسئلہ پر سیر حاصل بحث کر کے اس کا صحیح موقف واضح طور پر مدلل پیش فرمایا۔ اور تمہید میں چند مقدمات مرقوم ہیں، جن میں حکم، الہام سرور دو عالم، اولیائے کرام، و انواع علوم دینیہ و عرفا و فقہا و اجتہاد و ادلۂ شرعیہ ماہیۂ فقہ وغیرہ کو نفس نفیس لکھا ہے اور بعد ازاں چالیس ۴۰ عناوین کو زیر بحث لایا ہے جن کو ہم مندرجۂ ذیل نقل کرتے ہیں:۔

۱۔ در ادلۂ اربعہ شرعیہ	۲۔ در فعل مکلف
۳۔ در تکالیف شرعیہ	۴۔ در احکام حج
۵۔ در حکم طواف غیر کعبہ	۶۔ در اقسام خیانت
۷۔ در حکم دعا و صدقہ برائے موتیٰ	۸۔ تعین صدقات
۹۔ در حکم نذر	۱۰۔ در حکم سور آدمی و ذبیحہ مشرک
۱۱۔ در حکم تمباکو و کتابی و حکم طعام ہر دو	۱۲۔ در حکم میلاد
۱۳۔ در زیارت موئے شریف	۱۴۔ در تذکرہ مناقب و فضائل صلحا و اتقیا
۱۵۔ در تذکرۂ حسن و جمال خوبرویاں	۱۶۔ در مراتب دعوت و اعیان حق
۱۷۔ در حکم تعمیر قبہ و قبر	۱۸۔ در حکم تکفین اہل قبلہ
۱۹۔ در حکم سجدہ تحیت	۲۰۔ در آداب مصاحبت و مخالطت
۲۱۔ در سلام سنت	۲۲۔ در بیان تصوف
۲۳۔ در خلاف شاہ ولی اللہ یا سائر صوفیہ	
۲۴۔ در احکام حوض طور نبوت و طور ولایت	۲۵۔ در حکم رقی و اولاد
۲۶۔ در خوبی تواضع و پستی	۲۷۔ در عشق
۲۸۔ مراقبہ ربط قلب با شیخ	۲۹۔ در علم غیب
۳۰۔ در علامات انبیاء و اولیاء	۳۱۔ در زیارت قبور و سفر زیارت
۳۲۔ در تبرک	۳۳۔ در اقسام ندا
۳۴۔ در بیان توسل و استمداد	۳۵۔ در ندا ارباب حاجات از اعزۂ احیا و اموات
۳۶۔ در دوگانہ قادریہ	۳۷۔ در فرق بین الندا و الدعا
۳۸۔ در وحدت الوجود	۳۹۔ در اختلاف معنی وحدت الوجود
۴۰۔ در اسانید وحدت الوجود۔	

ہر ایک عنوان کو گہرے فکر سے لکھا ہے اور علمائے عظام و صوفیائے کرام کے واضح بیانات کو دلائل سے نقل فرمایا ہے جس کا انکار کرنا دشوار ہے۔ چونکہ اولیاء و صوفیاء کا عملی تجربہ ان مسائل پر ہو چکا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کا انکار شپرہ چشمی کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے

اس نایاب کتاب سے لوگوں کی پھیلائی ہوئی بدگمانیاں دور ہو گئیں۔ گویا یہ کتاب اپنے نام کی زندہ تفسیر ہے۔ جو حق و باطل کو آفتاب نصف النہار کی طرح واضح کرتی ہے۔

اس کے مطالعہ سے ہم اس وقت کے ماحول اور آپ کے علمی و اصلاحی خدمات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو واقعی پر فتن و بگڑے ہوئے دور اور فاسد عقائد کے اصلاح کے وقت کا ایک اہم ترین فریضہ تھا۔

چنانچہ حضرت قطب ویلور نے گمراہ شدہ عوام و خواص کو عقائد صادقہ کی طرف متوجہ کیا۔ چونکہ ہمارے نظام زندگی میں عقائد کو سنگ بنیاد کہا جاتا ہے جس کے بغیر ایمان و ایقان کی مضبوط عمارت منہدم ہو جاتی ہے بریں بنا آپ نے ایک جامع تصنیف کے ذریعے لوگوں کو صحیح عقائد کی طرف رہنمائی کی۔ خصوصاً جنوب ہند یہ

آپ کا احسان عظیم ہے جسکو تاریخ ہرگز فراموش نہیں کرسکتی۔

چوتھی کتاب جواہر السلوک، یہ آپ کی آخری اور ۱۳۸۱ھ کی تصنیف لطیف ہے۔ درحقیقت یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے اور تصوف کے مشکل ترین مسائل بڑے ہی سہل اور لطیف پیرایہ پر حل کئے گئے ہیں۔

صاحب مطلع النور مذکورہ بالا تصانیف پر اپنا تاثری نوٹ لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت قطب ویلورؒ کی مذکورہ تصانیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ۔ شیخ سمنانیؒ اور قیصریؒ۔ شیخ عبدالکریم جیلی۔ عبدالرحمن جامیؒ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی نظر سے اگر گذری ہوتی تو آپ کو چوم لیتے اور سینے سے لگا لیتے۔

افضل العلماء مولانا الحاج محمد یوسف کوکن صاحب M.A لٹ شعبۂ صدر عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی مدراس نے اپنے مضمون "حضرات صوفیاء کرام میں حضرت قطب ویلورؒ کا علمی مرتبہ" میں لکھا ہے کہ آپ (قطب ویلورؒ) نے یہ ساری کتابیں فارسی زبان میں لکھی ہیں جو بہت ہی شستہ اور شگفتہ ہے۔ زبان میں پوری سلاست پائی جاتی ہے، دقیق سے دقیق مضامین بھی نہایت عمدہ زبان میں ادا کر گئے، جس سے دل و دماغ کو بہت بڑی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ کتابیں اس لائق ہیں کہ "عربی مدارس" کے باقاعدہ نصاب تعلیم میں داخل کی جائیں۔ موصوف کی یہ رائے قابل ستائش ہی نہیں بلکہ قابل عمل بھی ہے۔

تصوف جو کبھی انسان کو انسانیت کی قدروں سے روشناس کیا تھا اور اخلاق محمدیؐ کا پیکر بنا یا تھا اس نازک اور پُرفتن دور میں جبکہ لوگ اخلاقی پستیوں میں گر چکے ہیں اور غلط عقائد کا شکار ہو چکے ہیں نہایت ہی ضروری ہے۔

حضرت قطب ویلورؒ نہ صرف بالغ النظر مصنف اور مجدد وقت تھے بلکہ صاحب تصرف و باکمال بزرگ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مثالی نمونہ تھے آپ سے کشف و کرامات بھی بکثرت واقع ہوے ہیں۔

مذکورہ تصانیف سے فراغت پاکر ۴ر شوال المکرم ۱۲۸۸ھ کو دوبارہ زیارت حرمین شریفین کے لئے ایک کثیر جماعت کے ساتھ جس میں آپ کے ہونہار صاحبزادے بھی تھے ویلور سے ارکونم اور مختلف مقامات پہ قیام کرتے ہوے گلبرگہ شریف پہنچے اور بمبئی میں چند روز قیام فرما کر جدہ روانہ ہوگئے۔ اور جدہ سے ۱ر ذی الحجہ بروز جمعہ مکہ معظمہ میں داخل ہوگئے۔ مناسک حج سے فراغت پانے کے بعد مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ جہاں آپ کو اتنا تیز بخار آیا کہ سجود و قعود دشوار ہوگیا۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ تشریف لے جانا دشوار ہوگیا۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی تھی لہٰذا حالت مرض ہی میں مدینہ منورہ پہنچے۔ ۱۱ر محرم الحرام روز پنجشنبہ کو یہ آفتاب اقطابؒ ویلور سرزمین

مدینۂ منورہ میں اللہ پاک کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ تاریکی سرزمین ہند پر ہی نہیں چھائی بلکہ سارا عجم وعرب بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ جس روز آپ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے اس شب حاکم مدینہ کے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا کہ جاؤ میرے اس برگزیدہ فرزند کو جنت البقیع میں امام حسن علیہ السلام کے پاس دفن کردینا۔ چنانچہ حاکم مدینہ جستجو کرتا ہوا الاش مبارک کے پاس پہنچا اور آپ سے لپٹ کر زار زار رونے لگا۔ جمعرات کو آپ کا وصال ہوا اور جمعہ کے دن آپ کے ہمشیرزادے سید شاہ محمد قادری بھی اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ اور دونوں جنازے مسجد نبوی سے متصل رکھے گئے۔ بعد نماز جمعہ ستر ہزار زائرین کی ایک کثیر جماعت نماز جنازہ میں شریک رہی، حضور پُرنورؐ کی وصیت کے مطابق جنت البقیع میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

جس طرح قدرت نے آپ کی زبان میں اثر عطا فرمایا تھا اسی طرح آپ کی تحریر میں بھی وہی اثر تھا۔ جتنا آپ نے زبان سے تبلیغ کا کام انجام دیا اس طرح آپ کی تحریر نے جادو کا کام کیا۔

خواہ علمائے ظاہر ہوں یا راہ سلوک کا کوئی سالک یا عارف ہر ایک نے آپ کی تحریر وتقریر سے ہر مشکل کا حل پایا اور سینکڑوں گم کردہ منزل نے آپ کی تصانیف دیکھ کر اپنی صحیح منزل کا پتہ لگایا اور منزل مقصود تک پہنچ گیا۔

حضرت قطب ویلورؒ کا امت محمدیہ پر احسان عظیم ہے اور اس خادم میں اتنی جرأت تحریر کہاں ہے کہ کما حقہٗ آپ کے بیش بہا زندۂ جاوید دینی کارناموں کو سپرد قلم کرسکے۔

جو ذات اقدس تا زیست عمر تحریری، تقریری تدریسی، دینی خدمات انجام دی ہو اور ان تمام مصروفیات ومختصر سی زندگی کے باوجود فانی اللہ ہوکر باقی باللہ کا مظہر بنے۔ ایسی کامل شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا حقیقتاً مشکل امر ہے۔ آپ کے انتقال پُرملال پر کئی ایک شعراء نے عقیدت کا اظہار کیا ہے، جن میں بعض کا کلام ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کررہا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

اُڑ گیا لطف جو تھا جینے میں	حشر برپا ہو گیا مدینہ میں
دائرے سے فلک کے قطب گرا	شعلۂ آہ آسماں پہ گیا
ابن سر دار خلد ہے آیا	باب جنت کیا ہے رضواں وا

روح بولا شہید آتا ہے
حور اہل نوید آتا ہے

مولانا مولوی عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی نے (جو آپ کے خلیفہ تھے) آپ کی تاریخ رحلت کہی ہے:۔

ملاحظہ ہو:

آں پیر محی ملت ودیں کز وجود او
علم وعمل چو عنبر و بوٗ، جزو علم ہم شدہ

شوقِ ادائے حجِ مکرر چو جوش زد
پایانِ عمر عازمِ طوفِ حرم شدہ
ہر چند اشتدادِ مرض ساختنش زبوں
فارغ زعزم خود بہ ثباتِ قدم شدہ
زیں پس پئے زیارتِ جدِّ بزرگوار
دربندِ انتظارِ زوالِ الم شدہ
بانگِ نعالِ یاولدی خورد تا بگوش
سرتا بپا بجوابِ زبانِ نعم شدہ
آخر بذوقِ مائدۂ نعمتِ وصال
داخل بروضۂ شہِ گردوں حشم شدہ
از بعد استفاضۂ کہ تا ہفتہ می نمود
مامور بہ اقامتِ عینِ ارم شدہ
ہم ظاہرا بہ قبۂ فرزندِ فاطمہ
قربِ جوار یافتہ و محترم شدہ
از روئے ایں اشارہ ضیا سالِ آں نوشت
مقبولِ بارگاہِ شفیع الامم شدہ

۸۹ ھ ۱۲

نیز آپ کی تاریخ رحلت

غاب قطب القدم

۸۹ ھجری ۱۲

سے بھی نکلتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم واہل بیت کے صدقے میں جمیع مسلمانوں کو راہِ مستقیم عطا فرمائے اور ثابت قدم رکھے اور سنت نبوی پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے ———

آمین بجاہ سید المرسلین ؐ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گلشن عالم میں روزانہ سینکڑوں پھول کھلتے ہیں، خوش رنگ پھول، خوشبو دار پھول، رنگ برنگی پھول، ان میں بعض تو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے انبساط اور سونگھنے سے کوئی خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے ہوئے کمھلا جاتے ہیں۔ پھر چمن میں انہیں کوئی پوچھنے والا تک نہیں ہوتا۔ کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کی بھینی بھینی کیف آور و روح پرور خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھتا ہے۔ اور ان کی دلکش و دلآویز رنگت ساری فضا کو فردوس بداماں کر دیتی ہے۔ یہی پھول ہوتے ہیں جن کو سارے چمن میں حیاتِ جاوداں مل جاتی ہے۔ اہل گلشن ان کے وجود سے شاداں اور عدم سے نوحہ کناں ہوتے ہیں ـــــــ

تقریباً دو تہائی صدی پیشتر دار السرور ویلور کے چمنستان میں ایک ایسا ہی پھول کھلا جس کی خوشبو سے تمام فضا مہک اٹھی۔ یہ پھول جب تک کھلا رہا اہل چمن اسکی دلکش رنگت اور کیف آور لپیٹوں سے مست و سرشار ہوتے رہے۔

آج اسی زندۂ جاوید گلِ سرسبد کی مست و پُرکیف اور روح پرور شمیم آمیز ذکر سے فضا کو معطر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

بخاری

رکن دیں رفت محی دیں آمد
آں چناں رفت ایں چنیں آمد

اعلیحضرت مکی قدس سرہ ۲۶ ربیع الاول روز شنبہ سنہ ۱۲۹۸ھ شام میں چار بجے ویلور دار السرور مکان حضرت قطب ویلور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادتِ باسعادت کی خبر سے سارا شہر جھوم اٹھا۔

بہار کے مہینہ میں بادِ بہاری کی اٹھکھیلیاں اور یہ مسرت افزا خبر عجیب سماں پیش کر رہی تھی۔

آپ کا مکمل نام اعلیٰحضرت مولانا مولوی سید شاہ عبد اللطیف قادری ہے لیکن آپ حضرت مکیؒ کے نام سے بہت مشہور ہیں۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا اسم گرامی قدوۃ السالکین شمس العلماء اعلیٰحضرت مولانا مولوی رکن الدین سید شاہ محمد قادری قدس سرہ العزیز ہے۔

آپ کا رنگ سانولا، پیشانی وسیع، گھنی ریش، کشادہ سینہ، قد میانہ، پُرگوشت و بارُعب چہرہ تھا۔ آپ کے پُرجلال چہرۂ مبارک کی طرف کسی کو دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بچپن ہی سے آپ ذہین و فطین تھے۔

آپ کی تعلیم اپنے آبائی دار العلوم لطیفیہ میں ہوئی جہاں سے آپ نے علوم شرعیہ میں کمال حاصل کیا۔ ابھی آپ کی عمر ستائیس سال کی تھی کہ سنہ ۱۳۲۵ھ میں آپ کے والدِ ماجد کا انتقال ہو گیا۔ مسندِ سجادگی پر رونق افروز ہونے کے بعد مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز کی تمام تر ذمہ داریاں اور معاملات آپ کے سر آگئے جن کو آپ نے انتہائی خوش اسلوبی اور عمدگی سے انجام دیا۔

آپ کے دورِ سرپرستی میں دار العلوم لطیفیہ برابر ترقی کی راہوں پر گامزن رہا۔ ملک کی باکمال شخصیتیں اور اساتذۂ روزگار جناب الحاج محی الدین حسین صاحب جیدہ، جناب مولانا عبد الجمیل صاحب پشاوری۔ جناب مولانا حافظ سید قاسم صاحب، جناب مولانا عبد الرحیم صاحب قریشی اور جناب مولانا احمد کویا صاحب شالیاتی[۱] وغیرہم مسند درس و تدریس پر فائز رہے۔

آپ سلف صالحین کی طرح ضلالت خیز تاریکیوں میں ہدایت کا روشن مینار بن کر قوم کے سامنے آئے، اور سینکڑوں تشنگانِ علوم کی سیرابی کا سامان کیا۔ آپ کی ان خدماتِ جلیلہ سے متاثر ہو کر نظام حیدرآباد نے ایک قطیر رقم آپ کی خدمت میں روانہ کی جس کو آپ نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا اور فرمایا کہ "یہ دار العلوم اللہ کے بھروسہ پر چل رہا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں وائسرائے ہند نے آپ کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے شمس العلماء کا خطاب پیش کیا۔

سینکڑوں انسانوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور اپنے دامنِ طلب کو عرفان کی موتیوں سے بھر لیا اور قابل ترین شخصیتیں خلافتِ عظمیٰ سے مشرف ہوئیں اور گمراہ انسانوں کی رہنمائی کی۔

آپ مستقل مزاج، بلند ہمت، بے باک اور صاف گو انسان تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں صوبہ مدراس کے گورنر لارڈ ولنگٹن[۲] کو آپ سے ملاقات کا اشتیاق دامنگیر ہوا۔ حضرت مکیؒ قدس سرہ سے اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر ویلور میونسپالٹی کے چیرمین سر محمد حبیب اللہ صاحب

؎۱ مذکورہ اساتذۂ کرام کے متعلق معلومات کے لئے سالنامہ اللطیف سنہ ۱۹۶۸ء، بعنوان ہمارے اساتذہ ملاحظہ کیجئے۔ ۱۲

انتظامات کے سلسلہ میں مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ تشریف لائے اور تمام جائزہ لینے کے بعد حضرت کیؒ سے کہا کہ صحن مسجد کا کمرہ منہدم کرا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ آپ نے برجستہ بلا کسی خوف کے فرمایا کہ یہ میرے آباواجداد کی مقدس یادگار ہے اور یہی وہ مبارک مقام ہے جس میں اعلیٰحضرت مولانا محی الدین شاہ عبداللطیف قادری ذوقی قدس سرہ العزیز نے پوری گلستان ایک رات میں نقل فرمائی تھی۔ لہٰذا کسی صورت میں اس کو توڑ نہیں سکتا۔ یہ سننا ہی تھا کہ چیرمین صاحب شرمندہ اور آب دیدہ ہو گئے۔ انتظامات کی تکمیل کے بعد لارڈ ولنگڈن اور ان کی بیوی آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ حضرت کی قدس سرہ العزیز نے جیسے ہی مکان سے باہر قدم رکھا لارڈ اور ان کی بیگم نے سینکڑوں انسانوں کے روبرو فقیر نما شہنشاہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور سر سے ہیاٹ اُتار دی۔ ایک فقیر کے آگے حاکم وقت کا سرنگوں ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ چیز قوتِ بازو و ثروت دنیا سے نہیں بلکہ صرف فضلِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہمیشہ عفو و درگذر آپ کا شیوہ رہا۔ اور آپ کا سفرہ "خوانِ یغما" تھا جس پر دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ عرب کہتے ہیں "العرق دسّاس" یعنی باپ کی عادتیں اولاد میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ بیشک آپ نے اپنے آباؤاجداد کے طریقہ پر چل کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ خاندانی شرافت، نیک صحبت اور اچھی تربیت آدمی کو انسانیت کی بلندی پر پہنچا دیتی ہے جہاں وہ ناقابلِ تسخیر بن جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ اس کی نظر میں امیر و غریب، شاہ و گدا سب ایک ہو جاتے ہیں۔ آپ کی سنجیدہ مزاجی اور رحمدلی کے باوجود لوگ آپ سے ایسے ہی ڈرتے تھے جیسے کسی بادشاہِ وقت کے دربار میں پہنچ گئے ہوں۔

مسجد حضرت مکان اور قلعہ ویلور کے درمیان ایک سڑک واقع ہے جو آج بنگلور روڈ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا معمول تھا، کہ بعد نمازِ فجر صحن مسجد میں کچھ دیر چہل قدمی فرماتے۔ آپ کی پُرجلال شخصیت سے لوگ اتنا متاثر تھے کہ راستہ چھوڑ کر خندق کے نشیبی راستے سے گذر جاتے۔ اس کا مشاہدہ کرنے والے ابھی موجود ہیں۔ اور آج بھی ان کی زبانیں اس قسم کے واقعات سے مرطوب ہیں آپ کے در سے کوئی سائل اور حاجتمند محروم نہ گیا آپ ان کی دلجوئی اور حاجت روائی کے لئے مقدور بھر کوشش کرتے، جہاں گل ہوتے ہیں وہاں خاروں کا ہونا لازمی ہے۔ گلِ بے خار کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں اشیاء کی حقیقت ان کے اضداد سے روشن ہوتی ہے۔ پھول جتنا حسین دلکش اور خوشبودار ہوتا ہے اتنے ہی خطرناک کانٹے اسے گھیرے رہتے ہیں۔ ایسا ہی جو

آدمی کیرکٹر عادات وخصائل کے اعتبار سے جتنا بلند ہوتا ہے اس کے دشمن بھی اپنی سرکشی وعناد میں انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، لیکن آپ نے اپنے کسی مخالف سے بدلہ نہ لیا۔

جذبۂ اطاعت وفرماں برداری بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کبھی والد بزرگوار کی حکم عدولی نہ کی۔ جو بھی حکم فرماتے بسر وچشم بجا لاتے۔ آپ کو زیارت بیت اللہ شریف کا بہت شوق تھا۔ اس لئے روپیہ جمع کرنے لگے۔ والد صاحب کو معلوم ہونے پر آپ کو طلب فرمایا اور کہا کہ سُنا ہے حج کے لئے روپیہ جمع کر رہے ہو۔ یہ تو ہم فقیروں کا شیوہ نہیں۔ ہاں جب حج کرنے کا وقت آئے گا تو ضرور جاؤ گے۔ اتنا سننا تھا کہ تمام جمع شدہ رقم اسی وقت خرچ کردی، پھر کبھی پس انداخت نہ فرمایا۔

آپ زندہ دل، صاحب تصرف وکمال بزرگ تھے اور آپ کی شخصیت مستجاب الدعوات تھی۔ شمالی ہند کے ایک مشہور تاجر جناب سکندر خاں صاحب نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں ایک ایسے پیر کامل کے دست مبارک پر بیعت کروں گا جو مجھے میرا نام لیکر آواز دے، اور وہ مجھے دیکھا بھی نہ ہو۔ موصوف لکھنو، دہلی، آگرہ، پٹنہ مدراس ہوتے ہوئے ویلور تشریف لائے۔ عصر کا وقت تھا، حضرت مکی قدس سرہ العزیز صحن مسجد میں ٹہل رہے تھے، خان صاحب مکان میں داخل ہوئے اور آپ کو سلام کیا۔ حضرت نے نہ صرف سلام ہی کا جواب دیا، بلکہ نام لیکر کہا آیئے سکندر خان صاحب کہئے کیسے آنا ہُوا۔ یہ سُننا ہی تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ گئے، کیونکہ حضرت قبلہ نے کبھی خان صاحب کی صورت دیکھی تھی نہ خان صاحب نے کبھی حضرت کو دیکھا تھا۔ یہی مومن کی فراست ہے جس کے متعلق زبانِ نبوت یوں گہر فشاں ہے۔ اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔ خان صاحب کو اپنا مدعا مل چکا تھا۔ فوراً آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرلی، وہ دن موصوف کے لئے عید سے کچھ کم نہ تھا۔

قلعہ ویلور کی خندق سے متصل بڑکے پیڑ کے نیچے ایک صاحب تھے، ہمیشہ انکی زبان پر یا میرے پیر حضرت قربی کا ورد رہتا تھا۔ ایک شب قدوۃ السالکین اعلیحضرت مولانا مولوی رکن الدین شاہ سید محمد قادری سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز اور آپکے فرزند دلبند اعلیحضرت مولانا مولوی محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری قدس سرہ دونو حضرات نے بیک وقت خواب میں دیکھا کہ درگاہ شریف کا دروازہ کھُلا اور حضرت قربی قدس سرہ العزیز نے پیڑ والے صاحب کو اندر لے لیا اور پھر دروازہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد دونوں کی آنکھ کھل گئی۔ تحقیق معاملہ کے لئے باہر تشریف لائے، خادم کو دوڑایا، اطلاع ملی کہ انتقال ہوگیا ہے اس کے بعد دونوں حضرات نے انکی تجہیز وتکفین کا انتظام فرمایا۔

مذکورہ واقعہ کو اس مقام پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مکی قدس سرہٗ کے وقت میں رُونما ہوا۔ دوسرا یہ بتانا مقصود ہے کہ سادات کرام آل رسول اور بزرگان دین سے صحیح اعتقاد، اور وابستگی انسان کے لئے دینی اور دنیوی سرخروئی کا باعث ہوتی ہے، ان سے محبت اور عقیدت کا پھل ضرور ملتا ہے، سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدایا بحق بنی فاطمہ، | کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول | من و دست و دامانِ آلِ رسول

اتنے بلند پایہ صوفی منش انسان کی زبان سے نکلنے والے یہ کلمات ضرور کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ جبکہ حضرت سعدی علیہ الرحمہ اپنے ہر قول میں سچے ثابت ہوئے ہیں، صرف اسی ایک قول میں ان کی حقیقت پسندی سے انکار شپرۂ چشمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

ایک اور واقعہ جو آپ کے دَور میں رُونما ہوا ناظرین کی دلچسپی اور استفادہ سے خالی نہیں، کہتے ہیں کہ میسور سے مولوی سکندر صاحب تشریف لائے۔ مکانِ حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ میں مولوی محمد حسین صاحب چیدہ سے تعارف کے بعد بہت دیر تک دینی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ درمیان گفتگو میں کسی نے چائے پلائی جس کو دونوں حضرات نے نوش کیا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کی حالت بگڑ گئی۔ چیدہ صاحب تو گھر چلے گئے اور مولوی صاحب نے مسجد ہی میں قیام فرمایا۔ رات بھر بڑی بیقراری کا عالم رہا۔ بار بار حوض پر جاتے اور یہ چاہتے کہ اس میں کود جائیں۔ چار بزرگ درگاہ شریف سے نکلتے جن میں سے دو نزدیک تشریف لاتے اور موصوف کو پکڑ کے مسجد میں لٹا دیتے۔ کئی مرتبہ یہ معاملہ پیش آتا رہا۔ جب ہوش آیا اور صبح ہوئی تو درمیان تقریر میں آپ نے رات والے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مذکورہ بزرگ میرا ہاتھ پکڑ کے بار بار نہ لٹا دیتے تو میرا بچنا یقیناً محال تھا۔

آپ کا نکاح ۱۳۲۲ھ میں حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز کے ہمشیر زادہ سید شاہ عبدالقادر قادری عرف قادر باشاہ صاحبؒ کی صاحبزادی سے ہوا جن کے بطن سے چار۴ لڑکے اور دو لڑکیاں تولد ہوئیں۔

آپ کے بڑے صاحبزادے الحاج الحافظ مولانا اعلیحضرت ابو الفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری ۴ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ یکشنبہ کی شب پیدا ہوئے، ۱۳۳۹ھ میں مسندِ سجادگی کو رونق بخشی۔ ۱۳۷۸ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ نہایت خدا ترس حلیم مہمان نواز، غربا پرور، اور خلق احمدی کا بے مثال پیکر تھے۔ بیشک علامہ شاکر نائطیؒ نے آپ کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

آپ کی قدر یا خدا جانے
یا اُسے حق شناس پہچانے

دوسرے فرزند بلند اقبال مولانا مولوی،
اعلیحضرت ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر
صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی ۲۱ محرم الحرام بوقت
طلوع سحر روز چہارشنبہ ۱۳۲۵ھ میں پیدا ہوئے،
حضرت مکی قدس سرہٗ نے آپکی پیدائش کے بعد خواب
دیکھا کہ ہر شجر و حجر اور در و دیوار پر ابوالنصر قطب الدین
سید شاہ محمد باقر لکھا ہوا ہے۔ اس لئے یہی نام تجویز
فرمایا۔ ۲۲ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ میں مسند سجادگی
پر جلوہ افروز ہوئے۔ آج مکان حضرت قطب ویلور
قدس سرہ العزیز کی عظیم ذمہ داریاں آپ ہی کے
سپرد ہیں۔ آپ انتہائی اولوالعزم، بے باک اور صاف
گو انسان ہیں اور آپ کی باتیں بڑی بے لاگ ہوا
کرتی ہیں۔ مکان اور دارالعلوم لطیفیہ کے دن بدن بڑھتے
ہوئے اخراجات اور ہوش ربا گرانی کے باوجود کبھی
پریشان خاطر نہ ہوئے اور آپ پر کوئی مصیبت ایسی
نہیں آئی جو اپنی ناکامی پر چیختی چلاتی نہ رہ گئی ہو
آپ عزم و استقلال کی مستحکم چٹان ہیں، آپ کی اعلےٰ
ظرفی، حسن خلقی اور مہمان نوازی بے مثال ہے۔

حضرت مکیؒ قدس سرہٗ کے تیسرے فرزند
ارجمند حضرت مولانا ابوصالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر
صاحب قبلہ قادری المعروف بہ میراں پاشا صاحب
ہیں۔ آپ ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ
انتہائی خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ زینات کے علاوہ
دارالعلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ
العزیز کے عظیم و قدیم کتب خانہ کا انتظام آپ کے ذمہ
ہے۔ اعلیحضرت قبلہ مدظلہ العالی کے منجھلے بھائی اور
معاون ہونے کی حیثیت سے آپکی خدمات لائق صد
ستائش ہیں۔

آپ کے چوتھے فرزند دلبند حضرت مولانا ابوالحسن
صدرالدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری مدظلہٗ
۵ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ بروز چہارشنبہ صبح کے چار بجے
پیدا ہوئے۔ آپکی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی دارالعلوم لطیفیہ
میں ہوئی ۱۹۴۳ء میں محمڈن کالج سے B.A کیا۔
اس کے بعد لا کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم سے فراغت کے
بعد مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز کی تعمیر و
ترقی میں مصروف ہوگئے ۱۳۷۸ھ میں دارالعلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ کی منصب نظامت پر فائز
ہوئے۔

آپ کے اعلیٰ تدبر اور حسن انتظام سے دارالعلوم
شب و روز ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ آپ
طلبائے دارالعلوم کے حق میں پہلے ایک شفیق باپ ہیں
پھر ناظم۔ آپ کی شخصیت سراپا جمال ہے۔ مہمان نوازی
غرباء پروری، عفو و کرم، یہ تمام اوصاف آپ کی فطرت
ثانیہ بن چکے ہیں۔

حضرت صالحؒ قدس سرہٗ کی دو لڑکیوں میں
سے بڑی صاحبزادی مولانا ابوالصالح سید شاہ احمد صاحب

قادری المشہور بہ **سرکار** قدس سرہٗ جاگیردار عُرس
ورنگل اور دوسری صاحبزادی آپ کے (یعنی حضرت
مکّی کے) برادر عزیز حضرت سید غوث پیر صاحب قادری
کے صاحبزادے حضرت سید محمد قادری المعروف بہ
مُرشد پاشاہ صاحب علیہ الرحمہ سے منسوب ہوئیں۔
۱۳۳۸ھ کا واقعہ ہے کہ ایک شب آپ نے
خواب دیکھا کہ جدامجد حضرت قطب ویلور اور والدِ ماجد
قدس اسرارھما تشریف لائے ہیں اور زیارتِ حرم شریف
کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار نے کہا کہ آپ
قطبِ ویلور سے ملاقات کرو۔ جیسے ہی آپ ملاقات کے لئے
آگے بڑھے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا،
نہیں، حرم ہی میں ملاقات کریں گے۔ میں وہاں منتظر رہوں گا۔
اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ دوسری تیسری شب یہی
معاملہ پیش آیا۔ اب آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ خیال نہیں،
بلکہ ایک حقیقت ہے۔ صبح اٹھ کر سارا ماجرا والدۂ ماجدہ
کو سُنایا۔ آپ کے خوابوں کا یہ عالم ہوتا کہ صبح ہوتے ہوتے
ان کی تعبیر نکل آتی۔

اس رویاء صادقہ کی تعبیر کو سمجھتے ہوئے
والدہ آبدیدہ ہو گئیں۔ لیکن رضئی مولیٰ از ہمہ اولیٰ دامنِ
صبر کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ادھر حضرت مکّیؒ
قدس سرہٗ حج بیت اللہ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔
جیسے جیسے دن قریب آتے گئے اشتیاق بڑھنے لگا۔
اپنی اولاد امجاد اور تمام افراد مکان کو تسلی دی نصیحتیں
کیں، حقوق اللہ و حقوق العباد کے فلسفہ کو سمجھایا، اور
اسکی ادائیگی کے لئے تاکید فرمائی۔ رخصت کے وقت دامن
جھٹکتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مکان و مدرسہ کی عظیم ذمہ داریوں کے
پورا کرنے میں میرے اعضا مضمحل ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں
یہاں ایک حبّہ کا روادار نہیں۔ کسی نے پوچھا آپ نے کمسن
اولاد کے لئے کیا انتظام فرمایا ہے، شیخ وقت کے توکل
کو دیکھیئے اور جواب ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے پورے
اطمینان سے فرمایا کہ "میں اپنی اولاد کو خدا کے حوالہ
کرتا ہوں، وہی ان کا نگہبان ہے۔ یقیناً جو اللہ کے
حوالہ ہوتے ہیں وہ کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ اسی مقام پہ
رُک کر جب ہم تاریخ کے اوراق کو اُلٹتے ہیں تو سینکڑوں
سال پیشتر گذرنے والی ایک شخصیت نظروں میں گھوم
جاتی ہے وہ ہیں امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ
عنہ۔ آپ مسندِ خلافت پر متمکن تھے۔ عرب و عجم پر آپکی
حکمرانی تھی۔ اس کے باوجود جب انتقال کرنے لگے، تو
آپ کا کل ترکہ ۱۲ دینار تھا۔ اسی میں سے چند
دینار تجہیز و تکفین میں صرف ہوئے۔ بقیہ کو ورثہ میں تقسیم
کر دیا گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے بچوں سے
وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

یا بنی عصمکم اللہ ورزقکم فقد وکلت امرکم الی اللہ،	اے میرے بچو! اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے اور رزق دے میں نے تمہارے معاملہ کو اللہ

الذی نزل الکتٰب و هو یتولی الصالحین | کے حوالہ کیا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا وہی نیک لوگوں کا سرپرست اور والی ہے

اسی طرح حضرت مکی ؒ نے سینکڑوں روپیہ کی جائداد کے باوجود اس کو کبھی اپنی نہیں سمجھا۔ خود کو جائداد کا مالک نہیں بلکہ امین تصور کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح اپنی اولاد کو خدا کے حوالہ کر دیا۔ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ آپ کی مقدس اولاد اپنے اسلاف کی طرح ھدایت کی شمع فروزاں کئے ہوئے ایک عالم کی رہنمائی کر رہی ہے۔

الغرض ۳ر شوال المکرم ۱۳۳۸ھ بروز چہارشنبہ اپنے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا الحاج ابو الفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری، حضرت مولانا سید شاہ حیدر ولی اللہ قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مولانا شاہ حسین صاحب قبلہ قادری، آپ کے صاحبزادے جناب سید مخدوم پیراں صاحب۔ جناب مولانا حافظ سید قاسم صاحب جناب مولانا عبدالباسط صاحب اساتذہ دارالعلوم وغیرہم کے ہمراہ بعد نماز ظہر مکان حضرت قطبؒ ویلور پر وداعی نظریں ڈالیں اور سفر حج پر روانہ ہوگئے۔ شیخ وقت کی جدائی پر تمام کی آنکھیں اشکبار اور آوازیں بھرائی ہوئی تھیں۔

کاٹپاڈی جنکشن سے آپ ارکونم روانہ ہوئے۔ عصر و مغرب کی نمازیں وہیں ادا کی۔ طعام شب کے بعد بمبئی میل پر سوار ہو گئے۔ تقریباً رات کے ۲ ۱/۲ بجے کڈپہ پہنچے جہاں حضرت سید شاہ محمد قادری ہمشیرزادہ حضرت قطب ویلور قدس سرہما[۱] کے داماد حضرت قاضی سید شاہ مصطفٰی حسین علیہ الرحمہ باشندگان کڈپہ کے ایک جم غفیر کے ساتھ اسٹیشن پر منتظر تھے۔ آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اسی طرح راستہ میں مختلف مقامات پر عقیدتمند اسٹیشنوں پر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرتے اور دعاؤں سے مستفید و مستفیض ہوتے رہے۔ ریل ان مقدس سواریوں کو اپنی جلو میں لئے دوسری شب بمبئی اسٹیشن پہنچی۔ جناب سکندر صاحب جو آپکے مرید و معتقد تھے آپ کا شاندار استقبال کیا اور خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بمبئی میں آپ کے بہنوائی حضرت مولانا سید شاہ مصطفٰی صاحب قادری جاگیردار عرس ورنگل آپ سے آملے۔ یہاں سے جب آپ جہاز پر سوار ہونے لگے تو بمبئی کے سینکڑوں انسانوں نے آپ کو وداع کیا۔ آپ کا جہاز جیسے جیسے حرم مقدس سے قریب ہوتا جارہا تھا منزل جاناں کی قربت کے تصور سے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور آنکھیں اس مقدس گھر کو دیکھنے کے لئے بیچین ہو رہی تھیں، جسکو ابراہیم خلیل اللہ نے وادی غیر ذی ذرع میں اپنے فرزند دلبند کے ساتھ تعمیر کیا تھا جس کی طرف دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ پروانہ وار دوڑے آرہے تھے۔

جیسے ہی مکہ معظمہ پہنچے قافلہ سے لبیک اللھم لبیک کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حرم مقدس کا

---

[۱] رشتہ میں آپ حضرت مکی قدس سرہٗ کے ہم زلف بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ حضرت سید شاہ محمد قادری اور سید شاہ عبدالقادر قادری قدس سرہما دونوں حضرت قطب ویلورؒ کے ہمشیرزادے تھے ۱۲

دلکش و پُرفضا منظر دیارِ حبیب کی رعنائیاں روح کو تازگی بخش رہی تھیں۔ وفورِ شوق سے بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ابھی حج کے لئے کچھ دن باقی تھے، وہیں مکۂ معظمہ میں قیام فرمایا۔ ایک دن آپ جنت المادیٰ میں فاتحہ پڑھ رہے تھے کہ اچانک آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مصاحبین کو تشویش ہوئی لیکن استفسار کا یارا کسی میں نہ تھا۔ اسی دوران قیام میں فرماں روائے حجاز شاہ حسین نے آپ کی پُرتکلف ضیافت کی۔ حج کے دن آئے ارکانِ حج کو عمدگی سے ادا فرمایا۔ اس کے بعد آپ کو معمولی سا بخار آنے لگا۔ یہی حالت دو دن تک رہی۔ آپ کو معلوم ہی تھا، نقارۂ اجل کو سمجھ گئے۔ ۱۹ر ذی الحجہ پر جناب مولانا عبدالباسط صاحب کو خلافت نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ حرم پاک کے اندر اپنے بڑے صاحبزادے حضرت الحاج الحافظ مولانا مولوی ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادریؒ سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت لی۔ اکیسوا کا نوے سلاسل کی اجازت دیتے ہوئے اپنے دستِ فیض اقدس سے خرقۂ خلافت پہنایا، اور سندِ خلافت عطا فرمائی۔ اسی دن ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ میں آپ کی روح مبارک قفسِ عنصری سے رفیقِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

دوسرے دن ۲۰ر ذی الحجہ کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ ایک لاکھ سے زاید مقامی اور بیرونی حجاج کرام اور فرماں روائے حجاز شاہ حسین نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔

اس وقت ہر ایک کی عجیب کیفیت تھی۔ تمام بیقرار و اشکبار تھے۔ خصوصاً آپ کے صاحبزادے، اور مصاحبین پر غم و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ دن تو روزِ قیامت سے کم نہ تھا۔ سرتاج کو لیکر گئے تھے، اب اپنی بے تاجی پر رونے لگے۔

نمازِ جنازہ کے بعد جنت المادیٰ میں اسی مقام پر جہاں کچھ دن پیشتر آپ آبدیدہ ہو گئے تھے سپردِ خاک کیا گیا۔ اس طرح یہ آفتابِ دکن مکہ کی مقدس خاک میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا ؎

آسماں انکی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

از حافظ بشیر الحق قریشی ادھونی متعلم زمرۂ ثالثہ
دار العلوم لطیفیہ ویلور

ظہورِ اسلام سے قبل نہ صرف عرب بلکہ دُنیا کے گوشہ گوشہ میں درندگی اور وحشت و بربریت، عیش و ہوس پرستی، حرص و طمع، سفاکی و خوں ریزی، قتل و غارت گری اور اخلاقی پستی کا بازار نہایت گرم تھا۔ اگرچہ بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر مصلحین اور معلم الاخلاق ہستیوں نے ندائے توحید و اخلاق بلند کی تھیں، لیکن زود فراموش انسانوں کے ذہنوں سے اس کا اثر جاتا رہا اور صدائے توحید انقلاباتِ زمانہ اور اسکی فتنہ انگیزیوں اور ہنگاموں میں دب کر رہ گئی۔

حتیٰ کہ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام پر کرۂ ارضی کا ذرہ ذرہ نورِ الٰہی کی ایک خفیف کرن سے بھی محروم تھا۔ توحید و خدا پرستی کی جگہ پتھر کی مورتیوں، درختوں اور چاند سورج، ستاروں اور آگ وغیرہ نے لے لی تھیں، بس یوں کہئے کہ پورا عالم ضلالت و گمراہی اور تاریکی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

انگلستان جسکو آج ساری دنیا سفینۂ علم و دانش کا ناخدا تصور کرتی ہے اُسوقت اسکی اخلاقی و تمدنی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ایران جس کی سرزمین کبھی ندائے توحید سے سرشار نہ ہوئی تھی، یہاں بہ کثرت ستارہ پرستی رائج تھی۔ اور ان کے نزدیک باپ بیٹی اور بھائی اور بہن کو اپنی زوجیت میں لینا ایک غیر معمولی سی بات نہ تھی۔ اور ہندوستان جسکی حالت بھی ابتر تھی۔ بعض ہندوستانی تو عورتوں اور مردوں کو برہنہ کر کے پوجا کرتے تھے اور عورت کو شوہر کے انتقال کے بعد زندہ نذرِ آتش کر دیتے تھے۔

بقول حالی:

وہ قومیں جو ہیں آج غمخوارِ انساں،
درندوں کی اور انکی طینت تھی یکساں

ایسے پُر آشوب اور پُر فتن دور میں اسلام کا جلوہ گر ہونا ہی عالم پر ایک عظیم ترین احسان ہے جس سے کوئی فرد بشر سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کی برکات و عنایات کا کما حقہٗ جائزہ لیا جائے تو یہ موضوع ایک مستقل کتابی شکل اختیار کر جائے گا۔ لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ صرف چند عنایات پر روشنی ڈالوں۔

زنا جسکو باعث فخر سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسے اور اسکے قریب جانے سے بھی منع فرمایا۔

ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء

سبیلا" تم زنا کے قریب مت جاؤ بلاشبہ وہ برائی ہے۔"
اور شراب جو ام الخبائث ہے اس کو حرام قرار
دیا اور چوروں کے لئے یہ حکم نافذ فرمایا
السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما چوری
کرنے والا اور چوری کرنے والی عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو
اور سود خواری کو حرام ٹھہرایا۔

الغرض انسانوں میں جو جو برائیاں وخامیاں تھیں
یکے بعد دیگرے ہر ایک کو چن چن کر ختم کیا۔ یہ طرۂ امتیاز
صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے دنیا کو تہذیب و
تمدن، قانون، اتحاد، عدل وانصاف، مساوات، اخلاق
رحم وکرم، شفقت وہمدردی، جود وسخا، اخلاق وایثار
حلم وعفو، امانت ودیانت، تواضع وانکسار، راست بازی
راست گوئی، ورع وتقویٰ کے زرین اصول پیش کیا۔

اسلام کا دنیا پر سب سے عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے
انسان ہی نہیں بلکہ حیوانوں کی بندگی سے نجات دلاکر تمام
کو خدائے وحدہٗ لاشریک کے آگے سرنگوں فرمادیا۔

اور اتحاد جس کا اسلام کے قبل نام ونشان نہ تھا،
بلکہ اس کی جگہ نفاق اور باہمی عصبیت نے لے رکھی تھی اور
چھوٹی چھوٹی باتوں پر تلواریں نیام سے باہر آجاتی،
تھیں اور آپس میں صدیوں تک خون کی ندیاں بہتی رہتی
تھیں اور ایک مدت سے جو نفاق کے شعلے بھڑک رہے
تھے اسلام نے اسے سرد کردیا اور ساتھ ہی ساتھ اتحاد و
اتفاق اور یکجہتی و یگانگی کے لئے بھی قرآن نے
اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا
وتذھب ریحکم یعنی اللہ اور اسکے رسول کی اطاعۃ
واتباع کرو اور آپس میں مت لڑائی جھگڑا کرو، ورنہ تم
کمزور ہوجاؤ گے۔ اور تمہاری عزت وساکھ دھاک
سب ختم ہوجائے گی اور درحقیقت اتحاد بھی ایک ایسی
عظیم قوت ہے جس کے بغیر دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم
بھی خوشی کی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ گویا اتحاد ہر ملک و
قوم کی بقا و دوام کیلئے جزو لاینفک ہے"۔

اور صنف نازک جس پر اسلام سے قبل بے حساب
ظلم واستبداد کے پہاڑ ڈھائے جارہے تھے اور جانوروں
کی طرح مقید رکھا جاتا تھا اسکی بیع وشرا جائز وحلال تھی
اور خود ہمارے ہندوستان میں یہ مذموم رسم عام تھی
کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورتیں ستی ہوجایا کرتی
تھیں، حتیٰ کہ بعض قبائل عورت کو زندہ درگور بھی
کردیتے تھے۔ یہ سہرا صرف اسلام ہی کے سر ہے کہ
اس نے عورت کو غارِ مذلت اور پستی سے نکال کر نہایت
اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمایا جو اس سے قبل دنیا کی
تاریخ میں عورت کو نصیب نہ ہوا تھا۔

اسلام کا عورتوں پر اس سے بڑھکر اور
کیا احسان ہوسکتا ہے۔ جہاں اسکی نسل ہی کا خاتمہ کیا
جارہا تھا وہاں اسلام نے لاتقتلوا اولادکم
اپنی اولاد کو قتل مت کرو، کا حکم جاری فرمایا۔

یہ اسلام ہی کا طفیل وصدقہ ہے کہ آج

عورتیں مقام سربلندی وسرفرازی اور مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ جہاں اسلام نے مردوں کے لئے کچھ حقوق متعین فرمائے اسی جگہ عورتوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کریم ناطق ہے یا ایھا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن الا ان یاتین بفاحشة مبینة وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا۔ اس آیت شریفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کے بھائی یا اور کوئی وارث اسکی بیوی کو زبردستی زوجہ بنانے کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ اسے دوسرے نکاح سے منع کرسکتا ہے بلکہ وہ خود ہی اپنے نکاح کی مختار ہے اور اگر صریح بدچلن وآوارہ ہو تو تم صرف روک سکتے ہو۔

ہمارے ملک کی لرزہ خیز رسم ستی کی اصلاح مسلم سلاطین نے کی اور مسلمان اس رسم کے نیست ونابود کرنے میں انتھک کوششیں کیں اور اس کی روک تھام کے لئے ہر صوبہ کے حاکم کے نام حکم جاری کیا کہ کوئی عورت ستی نہیں ہوسکتی اسکی کڑی نگرانی کی جائے۔ چنانچہ حاکموں نے اس معاملہ میں سختی سے نگرانی کی اور اگر کہیں اس کا پتہ چلتا تو عورتوں کو مختلف طریقوں سے سمجھاتے اور جب ان کی کوشش کارگر ثابت نہ ہوتی تو عورتوں کو اپنی بیویوں کے پاس بھیج دیتے تاکہ ان کے سمجھانے سے تو باز آجائیں۔ الغرض مسلمانوں نے حتی الامکان کوشش کرکے اس مہیب رسم کا مکمل طور پر خاتمہ کیا اور اگر مسلمان اس گندی رسم کی جانب توجہ نہ فرماتے تو نہ جانے ہمارے دیس کی کتنی بے گناہ عورتوں کا خاتمہ ہوجاتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا فضل وکرم ہے کہ ہندوستانی قوم کو ایک عظیم ترین خسارے سے بچالیا۔

اسلام کی ایک اور بے مثال لازوال نعمت درس مساوات ہے جو اس سے قبل دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دنیا کا کم وبیش حصہ غلامانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور حکومت سرمایہ داروں کے زیر اثر تھی جس میں کمزور و بےبس اور مجبور لوگوں کا خون چوسا جاتا تھا اور آپس میں چھوت چھات ایک دوسرے کو کمتر اور کمزوروں کو غلام بنالینا عام بات تھی اور عورتوں کو تو نجس جنس اور پست ترین مخلوق تصور کرتے تھے لیکن اسلام نے آقا۔ غلام۔ بڑا۔ چھوٹا کالا۔ گورا سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کردیا۔ چنانچہ بانیٔ اسلام نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

لیس لعربي علی عجمي فضل
ولا للعجمي علی عربي فضل
ولا الاسود علی ابیض فضل
ولا لابیض علی اسود فضل

الا بالتقویٰ

ترجمہ: عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ عجمی کو عربی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کالوں کو گوروں پر فضیلت ہے اور نہ گوروں کو کالوں پر، مگر تقویٰ ہی سے۔

یعنی اللہ کے نزدیک ہم میں سے وہی محترم و مکرم سمجھا جائے گا جو صاحب تقویٰ ہو۔ آنحضور صلی اللہ کے قول مبارک سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے خواہ کوئی ملک یا کوئی قوم کیوں نہ ہو کسی پر کسی کو فوقیت و برتری اور سربلندی و اعزاز نہیں ہے اور غور سے دیکھا جائے تو یہی انسانیت کا عین تقاضہ ہے۔

اور قرآن نے اس حقیقت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: یا ایہا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ترجمہ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا فرمایا اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں منقسم کیا تاکہ تم لوگ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ خدا کے نزدیک تم میں وہی مکرم و معظم ہے جو متقی ہو۔

الغرض اسلام نے تو حیات انسانی کے ہر ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہوئے غلط روش، فاسد عقائد اور مہلک رسومات و بے جا روایات کا خاتمہ کیا اور انسان کو اسکی قدروں سے روشناس کراتے ہوئے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس کے اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کی عظیم نعمتوں کا ہمیں مستحق بناتے ہوئے دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران فرمائے۔

آمین۔ ثم آمین

بسلسلہ صفحہ ۳۸ فرما دیا ایسی ذلت و رسوائی کی زندگی سے راہِ حق کی حمایت میں سر کٹا دینا ہمارے لئے فخر کا سبب ہے۔ امام حسینؓ کی شہادت، آپ کی موت نہیں بلکہ یزید کی موت تھی۔ آپ کی شہادت نے اسلام میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس مفہوم کو کیا ہی بہترین پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

از عبدالرزاق
جولیالیہ
جماعت چہارم
متعلم لطیفیہ عربک کالج
حضرت مکان ویلور

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشۂ رسولؐ

روئے زمین پر نہ معلوم کتنی ہستیوں کا وجود ہوا اور ہو رہا ہے مگر جیسے آئے ویسے ہی اپنا کام انجام دیتے ہوئے اس دنیا سے اس طرح نیست ونابود ہوگئے کہ زمانہ میں کوئی ان کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔ لیکن انہیں ہستیوں میں سے چند ایسی بھی ہستیاں رونما ہوئیں کہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان کا نام صفحۂ ہستی پر موجود ہے اور تاقیام قیامت ان کے نام کا چرچا رہے گا۔ اور ان لوگوں نے خدا کی راہ میں سر کٹا کر دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ ایک مسلمان حق کے لئے سر کٹا سکتا ہے لیکن باطل کے آگے کبھی سر جھکا سکتا نہیں۔ انہیں برگزیدہ ہستیوں میں سے نور دیدۂ رسولؐ جگر گوشۂ بتول، دلبند علیؓ سلطان الشہداء حضرت **امام حسین** علیہ السلام بھی ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۵ شعبان ۴ھ بروز شنبہ مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم یہ خبر سن کر فوراً اپنی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لائے اور امام حسین کو لے کر پہلے داہنے کان میں اذان دی اور بائیں کان میں اقامت۔ اس کے بعد آپ کا اسم گرامی حسینؓ رکھا۔

رواج کے مطابق آپ نے ام فضلؓ زوجۂ عباسؓ کا دودھ پیا اور چند سال وہیں آپکی پرورش و پرداخت ہوئی۔

حضرت امام حسینؓ نے سات سال تک سرچشمۂ علم وحکمت مدینۃ العلم کی آغوش میں تربیت پانے کے بعد پدر بزرگوار باب العلم جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا "انا مدینۃ العلم وبابھا علی" کے نزدیک تربیت پائی۔ یہی وجہ تھی کہ جو اوصاف و کردار حضورؐ میں نمایاں تھے بعینہٖ وہی آپ کی ذات میں پائے جاتے تھے، جو سینۂ رسول سے منتقل ہوکر حضرت حسینؓ کے سینہ میں سما گئے تھے۔

حضرت امام حسینؓ بہت ہی حسین وجمیل تھے نیز آپ نہایت دانشمند اور بڑے ذی فہم تھے۔ آنحضورؐ کو آپ سے اتنی بے لوث وپرخلوص محبت تھی، کہ دیکھتے ہی حضورؐ کا غنچۂ دل فرط محبت سے شگفتہ ہوجاتا

فوراً آغوش میں لے لیتے اور حضرت امام کو بھی اتنی
ہی محبت تھی جتنی حضورؐ کو آپ علیہ السلام سے۔

حضرت عبداللہ بن شداد اپنے والد سے
ناقل ہیں کہ میں ایکمرتبہ حضور صلعم کے ساتھ نماز ادا کر
رہا تھا، سجدہ بہت طویل ہوگیا جس سے لوگوں کو یہ
گمان ہوگیا کہ وحی نازل ہوئی ہے یا کوئی امر واقع ہوا
ہے۔ میں سجدہ سے سر اُٹھاکر دیکھا تو امام حسینؓ آپ کی
پشتِ مبارک پر سوار ہیں۔ اختتامِ نماز کے بعد لوگوں
نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حسینؓ پشت پر سوار
تھے میں نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ان کی خواہش ادھوری
رہ جائے، لہٰذا میں سجدہ ہی میں رہا۔ جب خود بخود
اُتر گئے تو میں نے اپنی نماز پوری کی۔

ایک صحابی روایت فرماتے ہیں کہ ایکمرتبہ حضورؐ
حضرت عائشہؓ کے گھر سے اپنی لختِ جگر فاطمہؓ کے
گھر جا رہے تھے اچانک امامؓ کے رونے کی آواز آپ
کے گوشِ مبارک سے ٹکرائی۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نہیں
جانتیں کہ حسین کا رونا مجھ کو اذیت پہنچاتا ہے؟
اور ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ حسین مجھ سے ہے،
اور میں حسینؓ سے۔ حسین کا دوست میرا دوست ہے
خدایا تو بھی اس کو دوست رکھ۔ جو حسین کا دشمن ہے
وہ میرا دشمن ہے۔

اخلاق و اوصاف میں تو آپ پرتوِ رسولؐ
تھے۔ گویا یوں سمجھئے کہ سرورِ کائنات کے اخلاقِ حسنہ
سینۂ امام میں منتقل ہوگئے تھے۔ بس اتنا کہدینا کافی ہے
کہ آپ عکسِ رسولؐ تھے، وہی اخلاق اور وہی اوصاف۔ نیز آپ
نہایت دلیر و شجاع بھی تھے۔ شجاعت آپ کا وصفِ خاص
تھا، یہاں تک کہ راہِ حق میں حمایتِ حق کی خاطر آپ نے
اولاد کی بھی قربانیاں دیدیں۔ آپ کی زندگی کے جس زاویے
پر بھی نظر ڈالئے تو رسولِ خدا ہی کا رنگ جھلکتا تھا۔ حتیٰ
کہ جسمِ مبارک بھی۔

نیز آپؓ نے اپنی پوری زندگی عبادت و ریاضت
ہی میں صرف کر دی۔ آخر اس ذاتِ مقدسہ ہی کے سبط
تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ مخاطب فرمایا، کہ
قم اللیل الا قلیلا نصفہ او انقص منہ
قلیلا اگر آپ اپنے جدِ محترم کی اتباع نہ کریں تو پھر
اور کون ہے جو حضور کی کما حقہٗ اتباع کرتا۔ آپ کی
عبادت گذاری کا اندازہ صرف اس ایک امر سے لگایا
جاسکتا ہے کہ آپ نے باوجود سواری کی موجودگی کے
پچیس ۲۵ پاپیادہ حج ادا فرمایا۔ یہ آپ ہی کا خاصہ تھا،
کہ پُرخار راہیں بھی آپکے حق میں نرم و نازک پھول
ثابت ہوتی تھیں۔

یزید کی تختِ نشینی کے فوراً بعد اس نے تمام
والیوں کے نام فرامین روانہ کردیا کہ ہر شہر کے سرافراز
لوگوں سے میری بیعت لی جائے۔ جب یہ فرمان والیٔ
مدینہ ولید بن عقبہ کو ملا تو ولید کو اسکی تعمیل میں خطرات
نظر آئے لہٰذا اس نے مروان بن حکم سے مشورہ

طلب کیا تو مروان نے یہ رائے پیش کی کہ بیعت کا مطالبہ کرو۔ جو بیعت قبول نہ کرے اس کا سر قلم کردو۔ اس مشورے کے بعد حضرت امام حسینؓ حاضر کئے گئے۔ جب آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا "مجھ جیسا آدمی چھپ کر کبھی یزید کی بیعت نہیں کرسکتا اور نہ کروں گا۔"

ایک جانب سے بیعت کا معاملہ درپیش ہوا تو دوسری جانب سے اہلِ کوفہ نے آپ کو خطوط لکھنا شروع کیا کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ یہاں تشریف لائیے ہم آپ کو اپنا پیشوا بنائیں گے اور ہر طرح سے آپ کے مدد و معاون رہیں گے۔ آپ کی تشریف آوری کے بعد گورنروں کو خارج کردیں گے۔

غرض اہل کوفہ کے اس پیہم اصرار پر آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے کوفہ روانہ فرمایا کہ اگر اہلِ کوفہ کا میلان زیادہ ہماری ہی جانب ہو تو فوراً آگاہ کردینا۔ جب اہل کوفہ کو مسلمؓ کی آمد کی خبر ہوئی تو جوق در جوق آکر حضرت حسینؓ کی خلافت کیلئے ان کے ہاتھ پہ بیعت کی حتیٰ کہ ان کی تعداد "بارہ ہزار" ہوگئی تو مسلمؓ نے اہل کوفہ کی اس غیر معمولی عقیدت کو دیکھ کر حضرت امام حسینؓ کے نام ایک نامہ تحریر فرمایا کہ فوراً آپ کوفہ تشریف لائیں لیکن یہ جو کچھ ہو رہا تھا یزید اس سے بے خبر تھا۔ جب اس کو اس کا علم ہوگیا تو فوراً ایک ظالم و جابر گورنر عبید اللہ بن زیاد ملعون کو کوفہ کی خبر گیری کے لئے روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ حکم دیا کہ اہل کوفہ سے میری بیعت لو۔ جو تسلیم نہ کرے اس کے ساتھ سختی سے کام لو۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو گرفتار کرکے میرے دربار میں حاضر کردو۔ یہ فرمان ملتے ہی عبید اللہ بن زیاد راتوں رات کوفہ روانہ ہوا تاکہ لوگوں کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھانس لے۔ جب یہ کوفہ پہنچا تو لوگ واقعی اس کے فریب میں آگئے کہ یہ حضرت امام حسینؓ ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے اس کا پُرزور خیر مقدم کیا اور ہر طرح اس کی خاطر مدارات کرتے ہوئے محل میں لے گئے اور علی الصباح ابن زیاد نے اہل کوفہ کو جمع کرکے ہر طریقہ سے انہیں دھمکی دی اور ڈرا دھمکا کر یزید کی بیعت لے لی حتیٰ کہ تمام لوگوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرلی۔ صرف گنتی کے چند آدمی حضرت مسلمؓ کے ساتھ رہ گئے، یہاں تک کہ اس ملعون نے حضرت مسلم اور ان کے دونو فرزندوں کو شہید کردیا۔

حضرت امام حسینؓ کو جب مسلم بن عقیل کا خط ملا تو آپ نے مع اہل و عیال کے کوفہ کی تیاریاں کیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں صحابہ و تابعین اور بزرگوں نے آپ کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی کوئی رائے کارآمد ثابت نہ ہوئی۔

چونکہ مشیت الٰہی کچھ اور ہی تھی۔ چنانچہ کوفہ روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں مسلم اور ان کی اولاد کی شہادت کی خبر ملی تو یہ سن کر آپ کو بڑا صدمہ پہنچا۔

آخر کار آپ شہر
نینوا (کربلا) میں پہنچے۔ والی کوفہ ابن زیاد
نے حکم دیا کہ اہل بیت کو نہرِ فرات سے ایک قطرۂ
آب بھی ملنے نہ پائے۔ غرض ہر طریقہ سے پہرا لگا دیا
جس کی وجہ اہل بیت پانی کے ایک ایک قطرے کیلئے
ترس گئے۔ لیکن اس ملعون کو کچھ رحم نہ آیا۔ چنانچہ
تیسرے دن ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کو کربلا کے اس بے
آب وگیاہ ریگستان میں معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔

دوپہر تک آپ کے جاں نثار لڑتے لڑتے جہنمیوں
کو واصل جہنم کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہید ہو
گئے۔ صرف اب چمنِ فاطمی کا پھول راکبِ دوشِ
رسولؐ اور وہ بھی زخموں سے چور چور، نیز تین دن
کے بھوکے پیاسے، نہ کوئی ان کا معاون تھا نہ کوئی
مددگار صرف تن تنہا تلوار کے جوہر دکھاتے ہوئے
نڈھال ہوکر گھوڑے سے اُتر آئے، نماز جمعہ کے لئے
سجدہ ریز ہو گئے۔ اچانک شمر ذی الجوشن ملعون نے
تلوار کا وار کیا اور سنان بن انس لعین نے نیزہ مار کر
شہید کر دیا۔ ؎

سرداد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؓ

جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو اس کا
کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔ بے مقصد کوئی کام
نہیں کرتا۔ اسی طرح حضرت امام حسینؓ کا یزید کی بیعت
تسلیم نہ کرتے ہوئے مٹھی بھر غیر جنگ آزمودہ لوگوں
کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار ہوجانا اس میں بھی کچھ مقصد
ضرور تھا۔ لیکن بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا
ہوگئے ہیں کہ بیعت نہ لیکر جنگ کے لئے تیار ہوجانا
دنیوی مال و دولت اور خلافت کو حاصل کرنا تھا۔

یہ سراسر غلط ہے اگر آپ خلافت اور دنیوی مال
و دولت کے متمنی ہوتے تو مٹھی بھر شگوفہائے نا
شگفتہ کو ساتھ لے کر ہزاروں کا مقابلہ ہرگز نہ کرتے
اور نہ شہادتِ مسلم کی خبر سن کر یہ فرماتے کہ اہل کوفہ
صرف میرے ہی خون کے پیاسے ہیں ان کو تم سے
کچھ غرض نہیں۔ لہٰذا میں اجازت دیتا ہوں کہ جو چاہے
واپس جائے"۔ غرض جو اس غلط فہمی میں مبتلا
ہیں انہیں چاہیئے کہ اس سے باز آئیں۔

اگر آپ چاہتے تو اپنی جان ہی نہیں، بلکہ
اہل بیت انصار و مہاجرین تمام اہل حجاز کی جان بچا
سکتے تھے۔ یہ صرف یزید کی بیعت قبول کرنے پر منحصر
تھا لیکن سبطِ رسولؐ کا یہ جانتے ہوئے کہ یزید فاسق
و فاجر اور شرابخور ہے، جو طریقے اس نے اختیار کئے
ہیں جادۂ اسلام سے ہٹ کر ہیں۔ لہٰذا یزید کی بیعت
کرنا گویا ان تمام ناجائز و حرام احکام پر مہر صداقت
لگانا تھا مگر سبطِ رسولؐ کو یہ کب پسند ہوگا کہ دنیوی
لذتوں اور راحتوں کے عوض اپنے جدامجد کی
شریعت مطہرہ کو بدنام ہوتے دیکھیں۔ لہٰذا حضرت نے

بقیہ بر صفحہ ۳۴

گلہائے عقیدت
قدوۃ السالکین اعلیحضرت مولانا،
مولوی محی الدین شاہ عبداللطیف
قادری ملکی
سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور
قدس سرہما
کی بارگاہ میں جذبات و احساسات سے بھرپور آج سے
نصف صدی پیشتر
پیش کردہ گلہائے عقیدت کو
ناظرین اللطیف کی دلچسپی اور معلومات کیلئے پیش کیا جا رہا ہے
ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلہائے عقیدت

ہندوستاں میں حشر کا ساماں ہوا ہے آج — جس گھر کو دیکھئیے تو وہ ہُو کا مکاں ہے آج
جس دل کو دیکھئیے وہ پریشاں ہوا ہے آج — جس راستے کو دیکھئیے سُنساں ہوا ہے آج

کس کا ہے شورِ غم جو یہ سب لوگ روتے ہیں
کس کا ہے سوگ اشکوں سے دامن بھگوتے ہیں

ماتم میں کون ہم کو رُلاتا ہے اے خدا — سینے میں کون دل کو دُکھاتا ہے اے خدا
آنکھوں میں کچھ نظر نہیں آتا ہے ایخدا — اخبارِ غم یہ کون سُناتا ہے اے خدا

کس کی سُنائی آئی ہے سب بے حواس ہیں
سُنسان خانقاہیں، مساجد اُداس ہیں

وحشت پکارتی ہے چلو گھر سے ننگے پا — اُلفت کسی کی کہتی ہے جلنے سے ہاتھ اُٹھا
کہتا ہے کوئی کانوں میں کیا غضب ہُوا — سر پیٹ ہائے مکۃ میں مُرشد گذر گیا

سُن لو یہ آج رونے رُلانے کا ذکر ہے
دُنیا سے محی دین کے جانے کا ذکر ہے

اک شب میں دیکھا خواب کہ محبوبِ ذوالمنن — مشغول طوفِ کعبہ ہے چھوٹا ہے یہ وطن
جاری زباں پہ جد کے ہے الفت سے یہ سخن — جس بن میں تو رہے وہ بنے غیرتِ چمن

حیران ہیں مَلک تیرے عِزّ و وقار میں
قدسی تڑپ رہے ہیں تیرے انتظار میں

کہتے ہیں خواب میں انہیں جدِّ بزرگوار — اے افتخارِ جد و پدر! میں ترے نثار
فرقت میں تیرے دل کو نہیں آتا ہے قرار — سرعت سے اب کرو سفرِ کعبہ اختیار

ہے کیا ثبات دارِ فنا کے قیام کو،

کہتا ہوں تجھکو دیکھ لے بیت الحرام کو

یہ بات سُن کے چونکے جونہی پیرِ نامدار | قبلہ کی سمت جھک گئے سجدے کو ایکبار
کی عرض سر کو خاک پہ رکھ کر بہ انکسار | مولا تری فقیر نوازی کے میں نثار

ذرّے کو تو نے مہرِ درخشاں بنا دیا
اک مور کو کرم سے سلیماں بنا دیا

شکر یہ اس عطا کا کہاں تک کروں ادا | تیرے کرم سے گوہرِ مطلوب مل گیا
راضی تری رضا پہ ہے یہ عہدِ باوفا | بندہ ہوں اے کریم مجھے صبر کر عطا

بھُولوں نہ مرتے مرتے بھی میں تیری یاد کو
ہے آرزو کہ جلد میں پہنچوں مراد کو

یہ کہہ کے سر اُٹھایا تھا سجدے سے شاد شاد | وہ شوقِ وصل تھا کہ نہ تھی کچھ کسی کی یاد
خالق سے تھی یہ عرض کہ اے خالق العباد | جلدی عطا فقیر کو ہو منزلِ مراد

جب سے سُنا ہے لطف و کرم تیرا خواب میں
اُس وقت سے ہے آتشِ شوق التہاب میں

ناگاہ چرخ پہ خطِ ابیض ہُوا عیاں | تشریف جا نماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں | صوت حسن سے بانگی نے اسوقت دی اذاں

رخصت کی بات پیر کے مُنہ پہ جو آ گئی
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصّلوٰۃ | قائم ہوی نماز اٹھے پیرِ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلے ملک صفت | سردار کے قدم کے تلے تھی رہِ نجات

مرشد تھے جا نماز ھدایت مناط پہ
یا قبلہ رو کھڑے تھے سلیماں بساط پہ

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز | بسم اللہ جیسے آ گے تھے مرشد پئے نماز
سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہ سرفراز | کرتی تھی خود نماز بھی انکی ادا پہ ناز

صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

وہ حسن صورت اور وہ قرأت وہ شد و مد | حقا کہ افصح الفصحاء ہے انہیں کا جد
گویا تھا لحن حضرت داؤد با خرد | یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد

شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

دُنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود | ان کے لئے تھی بندگی واجب الوجود
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود | طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود

خم گردنیں تھیں ان کی خضوع و خشوع میں
سجدے میں چاند تھے مہِ نو تھے رکوع میں

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام | آئے مصافحہ کو مریدانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام | آنکھیں ملیں قدم پہ کسی نے باحترام

حبل المتین یہی ہیں نجات ان کے ہاتھ ہے
قرآن اور آلِ محمد کا ساتھ ہے

دریائے نورِ حق کا سفینہ ہے محی الدین | عالم میں علمِ دیں کا مدینہ ہے محی الدین
اسرارِ معرفت کا خزینہ ہے محی الدین | انگشتری جہاں ہے، نگینہ ہے محی الدین

گھر گھر ہے فیضِ مرشدِ عالی مقام کا
ہر دل پہ ہے کھدا ہوا نقش انکے نام کا

باب السلام علم نبی آسمانِ شرع | نورِ سراجِ دین شرف خاندانِ شرع
دریائے لطف معدنِ بخشش نشانِ شرع | منہاجِ علم قطبِ زماں قہرمانِ شرع

اس کے کرم سے گلشنِ دیں تازہ ہو گیا
ہم سب پہ وا بہشت کا دروازہ ہو گیا

آفاق میں مروج دینِ خدا ہے یہ | حامیٔ شرع حضرتِ خیر الوریٰ ہے یہ

عالم کے سر پہ سایۂ بالِ ہُما ہے یہ | عالم میں ملک دین محمدؐ دیا ہے یہ

لاریب فیہ محرمِ اسرارِ حق یہ ہیں
ناطق ہے مصحف آپ کے میرے ورق یہ ہیں

کیسے ہو ہم سے مدح تیری مرشدِ انام | مدح و ثنا تیری نہیں ہرگز بشر کا کام
قدسی درود بھیجتے ہیں تجھ پہ صبح و شام | ہم خاک اور عرش سے اعلیٰ تیرا مقام

ذرے سے وصف نیرِ تاباں ہو کس طرح
ایک مور سے ثنائے سلیماں ہو کس طرح

بولے یہ اپنے ساتھیوں سے وہ بصد ملال | تم کو میرے سبب سے اذیت ہوئی کمال
اُلفت کا میرے رکھتے ہو دل میں جو تم خیال | اس امر کی جزا تمہیں دے ربّ ذوالجلال

بندے کو امرِ حق میں تامل روا نہیں
کیوں کر یہاں رہوں مجھے حکمِ خدا نہیں

جاری زبانِ پاک پہ مرشد کے یہ بیاں | گھر میں جو آئے روتے ہوئے مرشدِ زماں
پوچھا یہ ماں نے رونے کا کیا ہے سبب یہاں | دادا کو میں نے خواب میں دیکھا ہے اماں جاں

صدقے ہزار جان کرم ذوالجلال کے
گذری شبِ فراق، دن آئے وصال کے

اس دم پڑھے دُعائے سفر کو شہِ انام | چلا کے اٹھ کھڑی ہوئیں سیدانیاں تمام
چلنے لگا یہاں سے جو وہ زبدۂ کرام | مرشد کو اپنے جھک کے کیا آخری سلام

کہنے لگے کہ یوں جو جُدا ہم سے ہوتے ہو
تقصیر کیا ہماری ہوئی کیا خطا کہو

کہنے لگا یہ روتا ہُوا شیخ دیں پناہ | جاتا ہوں میں یہاں سے سُوئے خانہ اللہ
ثابت ہوا یہ مجھ پہ کہ تم میرے خیر خواہ | بے شک یہی ہے مہر و محبّت کی رسم و راہ

جینا اب ایک دم کا بھی خادم کو شاق ہے
وصلِ خدا کا مجھ کو بڑا اشتیاق ہے

سوئے مدینہ یاں سے چلا وہ باحترام | طوفِ حرم ادا کیا وہ زبدۂ کرام
رخصت کا جھک کے خانۂ حق کو کیا سلام | اور کی دعا یہ حق سے کہ اے خالقِ انام

پھر کر نہ یاں سے میں کبھی جاؤں گا گھر کو اب
جامِ اجل پلا دے مجھے یاں تو میرے رب

مرنے پہ میرے روئیں گے اب اقربا تمام | دے صبر ان کو بہرِ نبیؐ خالقِ انام
احباب بھی نہ چھوڑے میرے صبر کی زمام | بچے ہمیشہ کرتے رہے خدمتِ انام

مطلب نہ میرے دل میں ہے اسکے سوا کچھ اب
ہے التجا یہی تو عطا کر اے میرے رب

مرشد کو مرتے دم بھی ہمارا ہی تھا خیال | چھوڑیگا حشر میں ہمیں کیسے ہے محال
مرشد اسی کو کہتے ہیں یوں جو دمِ وصال | مدِ نظر ہی رکھے مریدوں کا اپنے حال

مکہ میں ہائے اپنا یہ مرشد گذر گیا
بے کس وطن میں اپنے مریدوں کو کر گیا

دارائے شرعِ مصطفویؐ مقتدائے خلق | خضرِ صراطِ دین مبیں پیشوائے خلق
فیض و عطا و شفقت و رحمت برائے خلق | غمخوار و غمگسار و حاجت روائے خلق

بھیجیں نہ کیوں درود ملک روح پاک پر
رحلت ہوی ہے شیخ کی مکہ کی خاک پر

اس کا میں ذکرِ پاک زباں سے ہوں کر رہا | پیارا علی کا فاطمہ زھرا کا لاڈلا
صلِ علےٰ زباں سے کہو سب بصد بکا | ہم جس پہ مرتے تھے وہی رہبر گذر گیا

سب پڑھ لو فاتحہ کہ یہ برسی ہے پیر کی
رخصت ہوی ہے سبطِ بشیر و نذیر کی

اس کے ہی غم میں حوض بنا دیدۂ پر آب | مسجد ہوی اداس ہے منبر کو اضطراب
محراب کھا رہا ہے ابھی تک بھی پیچ و تاب | آنسو بہا رہے ہیں جماعت کے شیخ و شاب

آواز دے رہا ہے مؤذن پکار کر

لوگو سروں کو پیٹو، کہ مُرشد گیا گذر

بے وارثوں کا مونس و غم خوار مر گیا | بے واؤں بے کسوں کا مددگار مر گیا
سب مومنوں کا قافلہ سالار مر گیا | مدرسہ اُداس ہے کہ سردار مر گیا

خیرات دو، نمازیں پڑھو اور دُعا کرو
لوگو! حقوقِ مرشدِ والا ادا کرو،

جس روز سے جہاں میں لایا ہمیں خدا | اس دن سے ایکدم بھی نہ مرشد سے تھے جُدا
مرنے سے پیر کے نہ رہا زیست کا مزا | جب رُوح ہی نہ ہو تو بدن میں رہیگا کیا

دن رات اب فراق میں مرشد کے مَرتے ہیں
دن اپنی زندگی کے بس یوں گذرتے ہیں

مرشد چھٹا ہمارا ہے روتے ہیں آج ہم | چھایا ہوا ہے دل پہ ہمارے سحابِ غم
کرتے ہیں عرض حق سے یہ ہر دم بچشمِ نم | کر رحم اپنے بندوں پہ اے صاحبِ کرم

چھٹ جائیں رنج و غم سے تو راحت نصیب ہو
بیٹھیں جو بوالحسن ہمیں فرحت نصیب ہو

آوازِ غیب آئی ہے سُن لو بصد ادب | تشویش اتنی کیوں ہے تردّد کا کیا سبب
راضی رہو اسی پہ کہ جو ہے رضائے رب | ایام رنج گذر رہے ہے راحت نصیب اب

مسرور شاد ہو کے صعوبت کے دن گئے
ایام فرح آئے، مصیبت کے دن گئے

بیٹھے ہیں آج مسندِ ابّا پہ بوالحسن | نانا کا ہے طریق تو دادا کا ہے چلن
قدسی دُرود پڑھتے ہیں سُن سن کے یہ سخن | جد آپ کے ہیں حضرت محبوب ذو المنن

تارا انہیں کی آنکھوں کا یہ نورِ عین ہے
مُرشد ہمارا سبطِ شہِ مشرقین ہے

یہ نورِ آفتاب رسالت ہے خلق میں | یہ آیۂ صحیفۂ رحمت ہے خلق میں
یہ بدر آسمانِ شریعت ہے خلق میں | یہ روغنِ چراغ ہدایت ہے خلق میں

یہ زیب بخشِ مسندِ شرعِ رسولؐ ہے
مشاطۂ عروسِ فروع و اصول ہے

برجِ وقارِ جاہ وحشم کا قمر ہے یہ | درجِ وعطا وخلق وکرم کا گہر ہے یہ
نخلِ ریاضِ عزّ وشرف کا ثمر ہے یہ | بستانِ فاطمہؓ و علیؓ کا شجر ہے یہ

جنّت ہے ملک اس کی جو حیدر کے ساتھ ہے
ناجی ہے وہ جو آلِ پیمبرؐ کے ساتھ ہے

عالم مطیع اس کا مطیعِ خدا ہے یہ | نانا کی شکل ہادیِ ہر دوسرا ہے یہ
بابا کی طرح خلق کا حاجت روا ہے یہ | سیّد ہے یہ امام ہے یہ پیشوا ہے یہ

تسبیح کا یہ ورد ہے اس کی صفات میں
سر رشتۂ عبادتِ خالق ہے ہات میں

جلوہ فروزِ ملکِ ھدایت ہوا ہے شاہ | مسند پہ آج بیٹھا ہے باشانِ عزّ وجاہ
دیکھو یہ ہے نبیرۂ سلطانِ دیں پناہ | ہوتا نہیں ہے ایسا کوئی آج بادشاہ

زیبا نہیں کسی کو کہ تکرار کیجئے
بیعت سے ان کی آپ نہ انکار کیجئے

خورشیدِ آسمانِ تحمّل ہے بوالحسن | طاؤسِ بوستانِ توکّل ہے بوالحسن
عالم تمام جزو ہے اور کل ہے بوالحسن | سب خلق عندلیب ہے اور گل ہے بوالحسن

جانیں فدا ہیں نام پہ اور دل نثار ہیں
یوسف ہے ایک چاہنے والے ہزار ہیں

گلدستۂ حدیقۂ ایماں ہے بوالحسنؓ | کشّافِ سرِّ معنیٔ قرآں ہے بوالحسنؓ
برجِ شرف کا مہرِ درخشاں ہے بوالحسنؓ | شانِ نزولِ رحمتِ یزداں ہے بوالحسنؓ

حقّا کہ نیّرینِ شرف کا یہ نور ہے
عزِّ نبی و شانِ علیؓ کا ظہور ہے

محبوبِ ذوالجلال کا پیارا ہے بوالحسنؓ | خیرالنساء کی آنکھوں کا تارا ہے بوالحسنؓ

ایمان کا جہاں میں سہارا ہے بوالحسنؓ | مرشد ہمارا پیر ہمارا ہے بوالحسن

یہ بھی تو ورثہ دارِ خدا کے ولی کا ہے
سب ان کو جانتے ہیں یہ پوتا علیؓ کا ہے

یہ عرش بارگاہ ہے مسند نشیں ہے یہ | سرچشمۂ جلالِ جہاں آفریں ہے یہ
روشن ہے جس سے بحر وہ دُرِّ ثمیں ہے یہ | کندہ ہے جس پہ نامِ خدا وہ نگیں ہے یہ

یہ وہ ہیں فیضِ دینِ خدا جن سے جاری ہے
جو تا ابد رہے گی وہ دولت ہماری ہے

یہ سالکِ طریقِ رہِ مستقیم ہے | یہ تابعِ رضائے غفور و رحیم ہے
یہ مستحقِ نعمتِ ربِّ کریم ہے | یہ نائبِ قسیم و جسیم و نعیم ہے

باغِ جہاں میں گلشنِ امید کھل گیا
ایسا ثمر نہالِ تمنّا کو مل گیا

جاری جہاں میں ہوئیں گے احکام شرع کے | پائیں گے سب امور سر انجام شرع کے
ہونگے مطیع طالبِ اسلام شرع کے | دم میں بنیں گے بگڑے ہوئے کام شرع کے

اس بوالفتح پہ شرع اب ہوگیا ہے ناز
اسلام کا عروج ہوا کیسا ہے نیاز

مرشد ہمارا قبلۂ دیں کعبۂ جہاں | خورشیدِ آسمانِ شرف عیسیٰ زماں
ظلِ الٰہ فیض رساں پیرِ انس و جاں | حاجت روائے خلق مددگار بے کساں

جلوہ ہے ذاتِ پاک میں خالق کے نور کا
سایہ رہے مریدوں کے سر پر حضور کا

تمت

ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ

از
محمد ابوبکر ملیباری لطیفی
لطیفیہ عربک کالج ویلور

ہندوستان کی تاریخ کے صفحات میں جلال الدین محمد اکبر کا نام اتنا درخشندہ اور روشن ہے کہ کئی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی اس کی تابندگی میں ذرہ برابر فرق محسوس نہیں ہوتا۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ اکبر نے اپنی خداداد قابلیت کی بدولت جو نظام مملکت قائم کیا وہ دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ یہ منصف مزاج بادشاہ اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو ہندوستانی طرز جہانبانی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی ہوتی۔

اکبر کی علمی قدر دانی اور کمال پروری نے لوگوں میں ایجاد و اختراع کی رُوح پھونک دی تھی۔ اس عہد میں فنونِ لطیفہ، مصوری، نقاشی، خوشنویسی کو عام عروج ہوا۔

غرض کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے کہ ایک بادشاہ نے عظیم الشان حکومت قائم کرنے کے ساتھ ہی اپنی رعایا اور ملک کو تہذیب و تمدن و علم و فن کا گہوارہ بنا دیا ہو۔

اس مضمون میں مجھے اکبر کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس کے ان واقعات کو بیان کرنا ہے جس سے سارے عالم پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اکبر، اَن پڑھ نہیں تھا بلکہ ایک علم نواز عالم تھا۔

ہم یہاں اکبر کی پیدائش اور اس کی تخت نشینی کو لکھتے ہوئے انشاء اللہ اس کے عالم ہونے پر بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اکبر کی پیدائش

ہمایوں بادشاہ زمانے کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ادھر ادھر سرگرداں پھر رہا تھا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تسلی دیتے ہوئے فرما رہے ہیں، گھبرا مت انشاء اللہ تیرا اقبال پھر ایک دن بلند ہوگا۔ تیرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھنا۔

؎ ایں خواب کہ از دیدہ جاں پروردہ گسل بود
خواہش نتواں گفت کہ بیداری دل بود

سولھویں صدی کے تقریباً وسط میں سندھ کے ریگستان میں امرکوٹ کے مقام پر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ہمایوں نے جلال الدین نام رکھا۔ پھر اکبر کا خطاب دیا۔ باپ نے اپنے چند ساتھیوں کو اپنے پاس سے کچھ مشک دیا۔ اور کہا کہ جس طرح سے اس مشک کی خوشبو پھیل رہی ہے اسی طرح میرے

بیٹے کا بھی سارے عالم میں چرچا اور شہرت ہو گی اور تمام لوگ خوشی منانے لگے ؎

ایں چہ مستی ست کہ بے بادہ و جام ست اینجا
بادہ کز جام نہ نوشند حرام ست اینجا

اور پھر ہمایوں نے کہا اس کے بعد اس سعادتمند لڑکے کی وجہ آج سے میری تمام تنگدستی ختم ہو جائیگی۔

؎ بر رہ بخت نہادم جبین ظلمانی
ہزار آئینہ آورنجم بہ پیشانی

اکبر کی تخت نشینی

ہمایوں کے انتقال ہوتے ہی سلطنت مغلیہ میں ایک زلزلہ آیا۔ سترہ دن کے بعد اکبر کا اتالیق بیرم خان اکبر کو کلانور (پنجاب) لیکر آیا اور کلانور کے ایک باغ میں اسے ۹۶۳ھ بمطابق ۱۵۵۶ء میں تخت نشین کیا۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام کے ساتھ انجام پائی۔

تخت نشینی کے وقت اکبر کی عمر صرف تیرہ برس نو مہینہ کی تھی۔ اس کم سنی کے باوجود اکبر ذہین اور ہوشمند ذی علم مدبّر تھا۔

اکبر کی مکتب خوانی

اکبر نامہ میں ابوالفضل تحریر کرتے ہیں کہ مسلم روایات کے تحت شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی بسم اللہ خوانی ، ۲ شوال المکرم بمطابق ۲۹ نومبر ۱۵۴۷ء میں ہوئی جبکہ اکبر کی عمر ۴ سال چار مہینہ چار روز کی تھی۔ وہ مؤرخین جو اکبر کے بارے میں صحیح رائے قائم کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ شہنشاہ جلال الدین اکبر بسم اللہ خوانی کے بعد دس سال تک تحصیل علم میں کوشاں رہے اور اس زمانے کے قابل ترین اساتذہ کے زیر خدمت تعلیم و تربیت حاصل کی جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :۔

مولانا عصام الدین ۔ مولانا ملا بایزید
مولانا عبدالقادر ، مولانا عبداللطیف ، مولانا پیر محمد
مولانا حاجی محمد خان اور ملا علاؤ الدین ، مذکورہ اساتذہ کرام میں سے ہر ایک اپنے وقت کا متبحر عالم اور ماہر فن تھا۔

بھلا بتائیے کہ اتنے قابل اساتذۂ کرام سے علم حاصل کرنے والا شخص کیسے جاہل ہو سکتا ہے۔ نیز ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے اور اس زمانے کے تاریخ دانوں کے خیالات کو مدنظر رکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکبر اچھا پڑھا لکھا آدمی تھا، کیونکہ آئینہ اکبری میں ابوالفضل تحریر کرتے ہیں، بڑے بڑے علماء اور علم نواز اشخاص اکبر کے دربار میں بڑی بڑی کتابوں کو پڑھکر سُنایا کرتے تھے۔ جب شہنشاہ مجلس برخاست کرنا چاہتا تو کتاب جہاں تک پڑھی جاتی اس صفحہ پہ خود اپنے ہاتھ سے نقل فرماتا کہ فلاں عالم فلاں بحث تک پڑھے ہیں۔ انہیں اتنا سونا اور چاندی تحفۃً عطا کیا جائے۔

ابوالفضل نیز تحریر فرماتے ہیں کہ اکبر نہایت

ہی خوشنویس تھا اور رسم الخط میں جو مختلف طریقے ہوا کرتے ہیں ان تمام میں نہایت دلچسپی سے مشغول رہتے۔ اسی وجہ سے اکبر کے دربار میں بہت سے خوشنویس خطاط موجود تھے۔ اور انہیں معقول تنخواہ خزانے سے ملتی تھی۔

اکبر کے جاہل نہ ہونے کا ایک اور بین ثبوت یہ ہے کہ ان کی اپنی آپ بیتی ظفر خانہ کے قلمی نسخہ کے جس کو مولانا شرف الدین علی یزدانی نے سنہ ۸۲۸ھ میں لکھا تھا اس میں موجود ہے۔ نیز اس قلمی نسخہ میں مرقوم ہے کہ یہ آپ بیتی خود اکبر نے اپنے ہاتھوں سے لکھی۔ آج یہ کتاب M. VICTRDE GOLOUBIN OF PARIS کی ملک خاص ہے۔

نیز اکبر نے قلمی نسخہ ظفر نامہ کے سرورق پر نقل کیا ہے کہ الف اور فرودین سے مراد یہ ایک فارسی مہینہ کا نام ہے جس میں اکبر کو یہ کتاب تحفۃً حاصل ہوی تھی۔

اکبر کے اخلاق اور اسکے کارنامے

اکبر نہایت دُور اندیش، مُدبر مستقل مزاج تھا۔ اہل کاروں کے انتخاب میں عقلمندی سے کام لیتا تھا اور علم وفضل کا بڑا قدردان تھا۔ رفیقوں کی قدردانی مغلوب دشمنوں کے ساتھ عفو کرم اور شاہانہ جذبات اکبر کو ایک عالم ہونے کی حیثیت سے اور اپنے بزرگوں کے ورثہ میں ملی تھی۔

اکبر ملکی انتظام اور فوجی تربیت میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا۔ ہر صوبہ میں ایک صوبہ دار مقرر کیا اور صیغۂ مالگذاری کی اصلاح کی۔

اکبر کے دربار کے نورتن مشہور ہیں۔ نیا سکہ رائج کیا۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان گہرے تعلقات قائم کئے جس کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔

راجپوتوں کی طاقت کو دیکھ کر اکبر ان سے رشتے ناطے کر کے ان کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے مسخر کر لیا۔ ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اس کے عہد کی مشہور تصنیف آئینۂ اکبری اس کی یادگار ہے۔

باون برس طویل حکومت کے بعد سنہ ۱۰۱۴ھ کو آگرہ میں فوت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسکندرہ کے ایک خوبصورت مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ جس کا نام اس نے بہشت آباد رکھا تھا۔

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی زندگی کا معیار

از
حافظ محمد کمال الدین
عارف بلیجوری
متعلم دار العلوم لطیفیہ مکان شریف حضرت قطب ویلور[؟] قدس سرہ العزیز

انسان اُنس سے مشتق ہے۔ اور اُنس کے معنی ہیں محبت وشفقت کے۔ ہاں یوں دیکھا جائے تو غیر ذوی العقول میں بھی یہ انسیت پائی جاتی ہے لیکن اللہ رب العزۃ نے انسان کو ایک بلند مرتبہ پر فائز کیا ہے لیکن ان دونوں میں فرق صرف ایک درجہ کا ہے۔ ایک درجہ فرق ہونے کی وجہ سے انسان حیوان سے اس طرح ممتاز ہو گیا کہ اشرف المخلوقات بن گیا۔ تو اب اشرف المخلوقات پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جس کے پورا کرنے سے انسان، انسان کہلاتا ہے، ورنہ یہ دونوں ایک ہی صف میں شامل کئے جائیں گے۔ وہ انسان جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت (عقل) کی قدر کرتا ہے اور اس کو کما حقہ، کام میں لاتا ہے، وہی کامیاب و کامران کہلاتا ہے اور وہی انعام واکرام کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے انسان ایسے ہیں جو اس نعمت کا شکریہ تو کیا اپنے وجود کو تک نہیں پہچانتے۔ یہ ان لوگوں کی عقل کا فتور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام پر یکساں طور پر برستی ہے، جیسے بارش چٹیل میدانوں میں بھی ہوتی ہے اور ہرے بھرے کھیت و باغات میں بھی ہوتی ہے۔ یہ بارش جب کھیت و باغات میں ہوتی ہے تو سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور چٹیل میدانوں میں ہونے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا لیکن بارش تمام پر یکساں طور پر ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسے شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہے لیکن اس سے نیش تو دوسری سے شہد پیدا ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے ہرن گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں لیکن ایک سے مینگنی، دوسرے سے مشک ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے ظلمتیں اور کثافتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہی غذا جب دوسرا کھاتا ہے اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے نئے ایک ہی طرح کی غذا کھاتے ہیں لیکن یہ خالی اور وہ شکر سے لبریز ہوتا ہے۔ خدا کی پیدا کردہ مخلوقات میں بھی بہت سے فرق ہوتے ہیں۔ زمین کو لیجئے، یہ عمدہ زمین ہے اور وہ شور۔ یہ فرشتہ ہے اور وہ شیطان، اس طرح کی لاکھوں ہم شکل چیزیں ہیں۔ لیکن اس میں کوسوں کا فاصلہ ہے لیکن اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ دونوں کی صورتیں اگر باہم مشابہ ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ میٹھا اور تلخ پانی دونوں کا رنگ صاف ہوتا ہے۔

لہٰذا دنیا میں حق و باطل کی یہی کیفیت ہے اس بات کے پہچاننے کا ذریعہ یہ ہے کہ ایک شخص قوم

کے لئے جو کچھ کر رہا ہے وہ ہمدردی کی غرض سے کر رہا ہے
اور دوسرا اپنے نمود و شہرت کی غرض سے۔ ابوجہل کو
بت پرستی میں وہی جوش، وہی خلوص، وہی سرگرمی، وہی
ازخود رفتگی تھی، جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو خدا پرستی
میں تھا۔ دونوں اسی دُھن میں جانیں دیں۔ لیکن ابوجہل
ابوجہل ہی رہا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سید الشہداء کہلائے

قرآن کریم ایک مجموعۂ صداقت ہے اس لئے اس نے
دنیا کی عام صداقتوں کے ساتھ دین و سیاست اور انسانیت
کو بھی اپنے دامن میں سب سے پہلے جگہ دی اور جو نور چند
لمحوں کے لئے کوہ طور پر چمکا تھا وہ ہمیشہ اس کے تاج
حقیقت کا طرہ زرنگار رہا۔ سیاست الٰہی فرعون کے تاج
وتخت کی ذمہ دار نہیں تھی۔ اس کا کام ابوجہل اور ابوسفیان
کی سیادت محفوظ رکھنا نہ تھا، وہ صرف دنیا میں میزان عدل
کے قائم کرنے کے لئے آئی تھی۔ اس لئے اس نے ایک فطری
مذہب کے آغوش میں اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ کیونکہ فطرت
ہی ایک ایسی چیز ہے جو خود عدل و انصاف سے سرمو
تجاوز نہیں کرسکتی۔

قرآن مجید جو فطری مذہب کی آغوش میں اپنے
آپ کو نمایاں کیا وہ فطری مذہب مذہب اسلام ہے، اور
مذہب اسلام کی خوبیوں سے کون واقف نہیں دنیا کا بچہ
بچہ اس کی حقیقت اور سچائی سے آشنا ہے لیکن یہ تمام
خوبیاں جاننے کے باوجود بھی یہ اسکی عقل کا فتور ہے،
جو اس کی مخالفت کر بیٹھتا ہے۔ اسکی حقیقت اور سچائی
کو جھٹلاتا ہے، یہ اسکی عقل کا فتور ہو یا قصور، جو بھی
ہو، لیکن اس بات سے منحرف نہیں ہوسکتا کہ ہر پیدا ہونے
والا فطرت الٰہی پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے والدین
اپنے طور وطریقے پر اپناتے ہیں۔ بس وہ بچہ مثل ایک
صاف آئینہ کے ہوتا ہے، بہت جلد اس کو قبول کرلیتا ہے۔
اور آئندہ چل کر وہ سچے مذہب کی مخالفت کر بیٹھتا ہے۔

سقراط نے بھی ایک مقام پر بہت ہی چبھتی ہوئی
بات لکھی ہے، کہتا ہے کہ "میں نہیں سمجھتا کیونکر لوگ
عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں۔ کسی بات کی صحت
پر ان کو یقین کامل ہوتا ہے، تاہم وہ اس پر کاربند
نہیں ہوتے۔ شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو۔ مگر
میں تو سمجھتا ہوں ان کا ارادہ ہی کا یہ نقص ہے۔ مجھے
آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین نہ ہو
اور نہ کر گذرا ہو۔ لوگ کچھ ہی سمجھا کریں مجھے ان کی مخالفت
کی پرواہ نہیں، اس لئے کہ میں ان کو داخل جمادات سمجھتا
ہوں۔" (افاداتِ مہدی)

دنیا کی تاریخ میں کتنے لوگوں کا ورود ہوا ہے
اور کتنے چل بسے ہیں اس کا اندازہ لگانا ناممکن بلکہ محال
ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اپنا معیار وکردار کو بلند رکھا،
ان کی حالات زندگی اور کارناموں سے آج بھی ان کا
نام زندہ وروشن ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی
حالاتِ زندگی کا بغور مطالعہ فرمائیں تو خود بخود بات

کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ حضرات کا طریقہ کیا رہا۔ معیار کس طرح تھے اور کیا تھے اور انسان کو انسانی زندگی پر کس طرح لا کھڑا کیا۔

ایک حق شناس مؤرخ لکھتا ہے، میں نے سوچا اور غور کیا کہ مدنی تاجدار صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کو یہ رفعت اور عظمت کیوں حاصل ہے؟ دل نے کہا رفعت ذکر کا یہ مجد و شرف اس رحمت عالم کو ضرور حاصل ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے اس آفتاب ھدایت نے اپنی ہمت عالی، اپنی عزم راسخ اور اپنی استقامت محکم سے دنیا میں ایک عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے نازک حالت میں مساوات کا پیغام پیش کیا۔ آپؐ نے اجڑی ہوی انسانیت کو تخت سیادت پر بٹھایا۔ آپ نے ظالموں کو رحمدل، سنگدلوں کو سراپا رحمت، غارت گروں کو ولی کامل اور وحشی درندوں کو صاحب معرفت بنا دیا۔ اسی لئے اس کے رب نے ورفعنا لك ذكرك سے خطاب فرمایا۔ دنیا کے حق شناس دوستوں سے یہ سوال ہے کہ کیا کسی بادشاہ کو اپنی مملکت میں یا کسی صدر کو اپنے اسٹیج میں، یا کسی لیڈر کو اپنے حلقۂ اثر میں وہ عظمت اور رفعت حاصل ہے، جو آپ کو حاصل ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانوں کا دل اس کی صداقت اور اس کے شاندار کارناموں سے متاثر ہیں۔ دل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس آفتاب ہدایت نے اس ملک کی اصلاح کی، جہاں کے

باشندے بدکاری اور زناکاری پر نادم نہیں ہوتے، بلکہ فخر کرتے تھے۔ جہاں غارت گری ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ جہاں شراب کا استعمال عام تھا، جہاں انسانیت لرز رہی تھی۔ جہاں ایک المناک درماندگی چھائی ہوی تھی۔ اس رحمت عالم نے خوش ربا تکالیف برداشت کر کے ظالموں کو رحمدل، سنگدلوں کو سراپا رحمت، غارت گروں اور بدکاروں کو پرہیزگاری کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچا دیا۔ آپؐ نے بلالؓ حبشی، سلمان فارسیؓ، صہیب رومی رضوان اللہ عنہم اجمعین کو اعلیٰ درجہ کی حجازی شرفاء کی صف میں لا کھڑا کیا۔ آپ نے رنگ و نسل کا نہیں بلکہ انسانیت کا احترام کیا۔ اسی لئے آج نسیم سحر کی دلکش جھونکوں کے ساتھ مشرق و مغرب کی مقدس مساجد میں آپ کے نام پاک کی پکار بلند ہوتی ہے۔ یہ رہا آپ کی مبارک زندگی کا معیار، پھر اسی کے مقابل کا بھی ملاحظہ فرمالیں۔

جن لوگوں نے خدا کے بھیجے ہوُے پیغمبروں کو ساحر، مجنون، پاگل اور دیوانہ کہا ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی ہیں اور ان کے ساتھ ہر موقع پر گستاخی کی ہے، بلکہ کبھی کبھی ان صالح بندوں کو قتل بھی کر دیا ہے لیکن اس سرکش انسان کا خون اس قدر گراں قیمت اور بیش بہا ہے کہ اس تمرد وطغیان میں بھی خدا نے اس کی حرمت کو قائم رکھا۔ لیکن جب سرکشی وعصیان نے بہت زیادہ سر اٹھایا اور خدا کے دائرۂ عفو وکرم سے آگے بڑھ گئی تو قانونِ الٰہی کو

بھی حرکت ہوئی اور خدا نے اپنے ظالم قوموں پر عظیم الشان مخلوقات
کو مسلّط کر دیا۔ انہوں نے ان کی بداعمالیوں کی پوری پوری
سزا دی۔

ثمود کو زمین نے پیس کر غبار بنا دیا۔ عاد کو ہوا کے
جھونکے خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئے۔ قوم نوح کو طوفان
کا ریلا تنکے کی طرح بہا لے گیا جیسے کہ قرآن مجید شاہد ہے'
واذا اخذ ربک الخ۔

انسان فطرت کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ اس بنا پر خدا
کی ان عظیم الشان مخلوقات کی طرح وہ بھی اسی فطری نظام
عدل کا پابند ہے۔ اور اگر وہ خدا کی تمام مخلوقات میں بڑا
ہے تو اس کو خدا کے نظام عدل کا بھی سب سے زیادہ پابند
ہونا چاہئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کی پابندیوں
کے جلوے دکھا کر انسان کو بھی اسی عادلانہ قانون کی پابندی
کا حکم دیا۔ اَلّا تطغوا فی المیزان واقیموا الوزن
بالقسط الخ جس طرح آفتاب و ماہتاب درخت اور
آسمان اپنے محورِ نظام عدل سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے
اسی طرح تم بھی اس میزان عدل کو پوری عدالت کے
ساتھ قائم رکھو اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدائی کا قانون
کس طرح کام کر رہا ہے لیکن دنیا پر یکے بعد دیگرے
متضاد قوتوں نے حکومت کی ہے۔ رات کے جانے کے
بعد ہمیشہ دن جلوہ گر ہوا ہے۔ تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی
چمکی ہے سیاہی کے بعد ہمیشہ سفیدی نے ظہور کیا ہے'
یہی حال حکومتوں اور سلطنتوں کا بھی ہے۔ ایک ظالم
حکومت مٹتی ہے تو اس جگہ اسی وقت ایک عادل سلطنت
قائم ہوتی ہے ظلم کا جانا ہی عدل کے ظہور کا پیغام ہے۔
رات اگر ختم ہو گئی ہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ دن آ گیا۔
جب جابرانہ قوتوں کی قوت فنا ہو جاتی ہے تو ایک عادلانہ
نظام قائم ہو جاتا ہے۔ فرعون کی جابرانہ سلطنت کا زوال
ایک دوسری قوم کی عادلانہ حکومت کا مقدمہ تھا۔ اس لئے
خدا نے فرعونیوں کی ہلاکت کے ساتھ ہی عدل الٰہی کے
قیام کا بھی مژدہ سنایا جیسا کہ آیت کریمہ وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ
علی الذین استضعفوا الخ

غرض اب تک ہم نے ایک صالح انسان کی زندگی کا
معیار پیش کرتے ہوئے چند قوموں اور چند بادشاہوں کی
سرگذشت کو بھی تحریر کر دیا۔ ہاں یہ اس زمانے کی بات
ہے جبکہ اسلام کا ابتدائی زمانہ یا اسلام سے پہلے کا دور
تھا' لیکن آج اس دور میں ایک انسان کی زندگی کا معیار
کیا ہونا چاہیئے تو اس سلسلہ میں بھی ایک دو باتیں لکھ
دیتے ہیں تاکہ مضمون اپنی تمامیت کو پہنچ جائے۔

اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عزت دیتے ہیں' اور
جس کو چاہے ذلت دیتے ہیں کسی کو مالدار اور کسی کو فقیر
بنانا تمام اس کے ہاتھ میں ہے کسی کو دولت اس لئے
دیتے ہیں کہ خدا کی نعمت حاصل کرنے کے بعد اپنے دل کو کس
حالت میں رکھتا ہے' لوگوں سے کیا اور کیسا برتاؤ کرتا
ہے۔ یہ اس کے لئے ایک امتحان ہے مفلسی اور فقیری اس لئے

دیتے ہیں کہ بندہ اس پے کسی اور مفلسی کی حالت میں کیا صبر و توکل کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بھی ایک امتحان ہے۔ وہ آدمی' جو دولت رکھتا ہے' جو اللہ تعالیٰ نے اسے نوازا ہے' وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے اور اپنی آمدنی جائز طریقہ پر خرچ کرتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی تمام دولت کو خدا کی راہ میں دین وملت کی خاطر صرف کرتے ہیں اور اپنے لئے کچھ حصہ استعمال میں لاتے ہیں جیساکہ حالات اور واقعات ہمارے سامنے موجود ہیں۔

لیکن وہ انسان جو مفلسی کی حالت میں جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا جب اللہ تعالیٰ انہیں دولت سے سرافراز فرماتا ہے تو ان کی مثال یوں سمجھئے۔ خاک کے وہ حقیر ذرے جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا جب آندھی کا ایک طوفان انہیں زمین سے لیکر فضا کی بلندی پہ لے گیا اور یہ انسانی سروں پہ رقص کرنے لگے تو یہ اپنی 'پستی' اور حقیقت کو بھول گئے اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ سربلندی انہیں ہمیشہ حاصل رہیگی۔ تھوڑی دیر بعد جب طوفان کم ہوا اور فضا میں سکون پیدا ہو گیا تو وہی حقیر ذرے جو فضا میں بڑے غرور سے رقص کر رہے تھے پھر زمین پہ آن پڑے اور بدستور پیروں تلے روندے جانے لگے۔ جب ان ذروں کو پیروں تلے کچلا جا رہا تھا تو کون ان سے کہہ رہا تھا' اے خاک کے حقیر ذرو! اپنے حقیر عارضی عروج کا انجام دیکھ لیا۔ انسانی ضمیر نے جب یہ آواز سنی تو اس نے دنیا والوں سے کہا یہ عروج سرتاپا فریب ہے۔

لہٰذا اوپر کی دونوں باتوں سے یہ حقیقت' کھل کر سامنے آتی ہے کہ دولت ہو یا نہ ہو۔ امیری ہو یا غریبی ہر حال میں لوگوں سے ایک ہی قسم کا سلوک و برتاؤ کریں۔ مال و دولت کے رہنے سے غرور اور نہ رہنے سے عاجزی' ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ ہر حال میں مخلوقِ خدا سے ہمدردی اور حسن سلوک سے پیش آئے۔ اس سے انسان کے بلند کردار و معیار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ایسے انسان کا ہر قول و فعل ہمارے لئے نصیحت و نمونہ ہوگا اور دنیا کی تمام قومیں اس کے قول و عمل کو ایک معیار کی حیثیت سے قبول کریگی۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزۃ اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے سے ہمارے اخلاق و عادات اور معیار و کردار بلند فرمائے اور ہمیں نیک توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مکتوب گرامی

اسرار و معارف سے بھرپور یہ مکتوب حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز نے اپنے مرید و خلیفہ مولانا عبد الرحیم صاحب ضیا حیدرآبادی کے جواب میں ۱۱ شوال سنہ ۱۲۸۷ھ کو تحریر فرمایا تھا۔ — ادارہ

بعد سلام مسنون کے معلوم ہو کہ النفات نامہ پچیس ۲۵ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۷ھ کو پہنچا اور خیریت کی خوشخبری اور اس میں شامل مضمون پر آگاہی ہوئی۔

الحمد للہ علیٰ ذالک، صالحین کی صحبت اختیار کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے۔ سعادت آثار آیۂ کریمہ انعمت علیھم، وانعم اللہ علیھم کی تفسیر، تفسیر حقانی اور عزیزی وغیرہما میں ملاحظہ فرمائیں معلوم ہو جائے گا کہ صالح کون ہے اور اس کی صحبت کی برکت کیا ہے؟ اسی جگہ ہے کہ خیر التابعین حضرت اویس قرنی صحابی کے ادنیٰ مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ حاصل یہ کہ اس غربت اسلام کے زمانہ میں کسی اہل اللہ کی صحبت کو غنیمت جاننا چاہئے۔

بعد ازیں معلوم ہو کہ راہِ خدا میں سلوک کے اندر سالک کو دو راستے سامنے آتے ہیں۔ ایک راہِ سلوک، دویم راہِ جذب۔ لیکن راہِ سلوک اور مجاہدہ جواہر السلوک کے فائدہ سی۳۳ و دویم میں دیکھنا چاہئے

کہ طالب کو لیقظہ و توبہ اور اوامر کے بجالانے و نواہی سے بچنے اور رذائل سے خالی ہونے اور فضائل اخلاق سے آراستہ ہونے کے بعد بزرگانِ طریقۂ قادریہ چشتیہ، نقشبندیہ، و مجددیہ کے اذکار و اشغال وغیرہا میں مشغول رہیں۔ ان اذکار و اشغال کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت کا حصول ہے جس کو سکینہ اور نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی میں ملئکہ سے مشابہت اور اس پر جبروت کی جانب آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اور راہِ جذب کو جواہر السلوک کے دسویں فائدے میں تلاش کیجئے جس کو سفرِ اول، سفرِ دویم، سفرِ سوم، سفرِ چہارم کہتے ہیں۔ اسفار و عروج کے اندر لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت کھلتی ہے۔ سفرِ اول میں اولیاء کے ولایت

حقیقت کھلتی ہے اور اسفار خمسہ دلی میں محمد رسول اللہ صلعم کی

کی انتہا ہے۔ اور سفر دوم ولایت انبیاء کی نہایت
اور سفر سوم عروجی میں ولایت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم
کی انتہا ہے۔ ولایت اولیاء کے اندر جذب کی
ابتدا فناء افعالی سے ہے، جس کو توحید افعالی کہتے
ہیں۔ اس کے بعد فناء صفاتی میں جس کو توحید صفاتی
کہتے ہیں۔ اس کے بعد فناء ذاتی میں ہے جس کا نام
توحید ذاتی رکھتے ہیں اور ان توحیدوں کو وحدت در
کثرت اور احدیت در کثرت بھی کہتے ہیں۔ اور اس
ولایت اولیاء میں یا تو حق کا شہود صورت کے آئینے
میں ہے یا معنیٰ (حقیقت) کے آئینے میں ہے۔
یا صورت و معنیٰ ہر دونوں کے اندر ہوتا ہے۔ اس کو
توحید وجودی کہتے ہیں، یا شہود حق، صورت و معنیٰ
کے ماوراء ہے اور اس کو توحید شہودی کہتے ہیں۔ اس
ادراک بسیط اور فناء الفناء اور تجلی برقی اور
نہایت ولایت اولیاء کہتے ہیں۔

اس مرتبۂ توحید شہودی میں حق کے سوا کوئی
مشہود نہیں ہے اور یہ ملائکہ مہیمیہ کا مرتبہ ہے
جو اپنے اور غیر کے ساتھ مشغول نہیں ہوتے۔ اور
ان مراتب جذب کو قرب نوافل کہتے ہیں۔ اور سفر
چہارم نزولی کے اندر عبد کی بقاء ذاتی، بقاء
صفاتی، بقاء افعال ہے جس کو بقا باللہ اور کثرت
در وحدت و کثرت در احدیت کہتے ہیں۔ اور ان
تمام مراتب بقاء کو قرب فرائض بھی کہتے ہیں۔

اور اسی جگہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ولایت اولیاء
اجمال ہے اور ولایت انبیاء اور ولایت محمدی
علیہم الصلوٰۃ والسلام ولایت اولیاء کی تفصیل
ہے۔ ولایت اولیاء کے اندر وحدت کے چہرے سے
کثرت کا حجاب دور ہوتا ہے اور ولایت انبیاء کے
اندر کثرت علمیہ باطنیہ (یعنی اسماء الٰہیہ کا قرب)
کے چہروں سے وحدت کا حجاب دور ہوتا ہے۔ اور
ولایت محمدی علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اندر تقئید
یا الضدین ظاہر اور باطن کا زوال احدیہ عین الجمع
میں حصول کے ساتھ ہوتا ہے۔ نیز جاننا چاہیئے کہ
لوگوں کی استعداد کے اختلاف سے ان کے سلوک کے
اندر بھی اختلاف ہے۔ اس مقدمہ کی بھی مختصر تفصیل
جواہر السلوک کے فائدے پچیس ۲۵ و چھپن ۵۶ میں پا سکتے ہیں،
آپ نے سنا ہو گا کہ علم منہ سے لو نہ کہ کتابوں اور
دفتروں سے، معاملہ قلم سے نہیں، سامنے رہنے سے
واضح ہو گا۔ اور ساتھ ساتھ اس کے فقیر اکیاسی ۸۱ سال
کی سرحد میں پہنچ چکا ہے اور گور کے کنارے بیٹھا ہے۔
اور اشغال کی کثرت اس کے علاوہ ہے۔ دل میں باتیں
تو بہت سی ہیں لیکن قلم اسکی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔
اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ہمیں اور تمہیں اور تمام
مسلمانوں کو روشن شریعت پر استقامت کی توفیق عنایت
فرمائے (آمین)۔ دنیا اور جو کچھ اسکے اندر ہے فنا ہونیوالی
اور خدا کی دھتکاری ہوئی ہے فریب دے، بیشک وہی
قریب اور دعا قبول کرنے والا اور ہر چیز پہ قادر ہے، اطراف کے تمام مخدومین احباب کو سلام پہنچائیں۔

از سید محمد حنیف ظہیر
زمرہ چہارم
کلچرلوی۔ چتور ضلع
متعلم دار العلوم لطیفیہ مکان
حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز

الجاهلون فموتی قبل موتهم
والعالمون وان ماتوا فاحیاء

جب سے کائنات کی تخلیق ہوی اس وقت سے لیکر آج تک انسان کی بزرگی کمال علم وادب کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے ہر زمانہ میں علم اور صاحب علم کو ہر ذی شعور انسان نے عزت کی نظروں سے دیکھا۔ چونکہ علم ہی ایک ایسا انمول جوہر ہے جو تمام دنیاوی نعمتوں پر فوقیت لے گیا۔ اسی لئے امیروں، شہزادوں، بلکہ بادشاہوں نے بھی اس پر رشک کیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خدائے عزوجل کی جانب سے آپکی قسمت میں علم اور اعدا کی قسمت میں مال کی تقسیم پر خوشی کا اظہار فرمایا۔

رضینا قسمة الجبار فینا
لنا علم وللاعداء مال

یہی وجہ ہے کہ دنیا نے استاد کی تعظیم و تکریم کو عین سعادت مندی جانا۔ خصوصًا مذہب اسلام نے اس کے درجہ کو بلند کرتے ہوے نماز جیسی اہم عبادت میں بھی فراموش نہیں کیا۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے للانسان ابوین ابو الجسد وابو الروح" فرماکر استاد کی عظمت کو کمال معراج پر پہنچایا۔ بھلا اس کے بعد استاد کی عظمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟

انسان کے دو باپ ہیں (۱) صلبی (۲) روحانی جسکو ہم آج استاد سے موسوم کرتے ہیں، حقیقی باپ پر اپنی اولاد سے متعلق یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کہ وہ اولاد کی پرورش کرے اور اس کو سیدھا راستہ دکھاتے ہوے اسکی حاجت کو پوری کرتا رہے لیکن روحانی باپ کا کام یہ ہے کہ ایک آدمی جو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور انسانیت کی اصلی روشنی سے محروم ہوتا ہے، اس کو انسان کے صحیح معنی سے روشناس کراتے ہوے گمراہی سے راہ راست پر لائے۔ اور استاد ہی ہے جو اپنے سینے کے خزانے کو شاگرد کے سینے میں منتقل کرکے جھوم اٹھتا ہے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کس طرح طالب العلم کو زمانہ میں کامیاب بنایا جائے۔ استاد کی شفقت اپنی طرف مائل کرلینے کے لئے نہایت کامیاب اخلاق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بغیر اس کی تعظیم و تکریم کے علم کا حاصل

ہونا ہر حال میں محال ہے۔ چنانچہ علامہ زرنوجی رحمہ نے
اپنی کتاب تعلیم متعلم میں فرمایا ہے۔

اعلم بان طالب العلم ولا ینتفع
به الا بتعظیم العلم واهله وتعظیم
الاستاذ وتوقیره یعنی طالب العلم اس وقت تک علم
حاصل نہیں کر سکتا اور اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب
تک کہ علم اور صاحب علم کی تعظیم نہ بجا لائے اور استاد
کی تعظیم اور اس کی تکریم نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ
علم کی تحصیل کے لئے استاد کی تعظیم وتکریم اور پھر صحیح
معنوں میں اس کی خدمت کی ضرورت ہے۔ اس کی تعظیم
اور محبت کے بغیر اس کے خزانۂ علم سے فیضیاب ہونا
ناممکن ہے۔ ایک سعادتمند طالب العلم کیلئے ضروری ہے
کہ وہ اپنے استاد کو آقا اور خود کو غلام تصور کرے۔

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا انا عبد
من علمنی حرفا واحدا ان شاء باع وان شاء
اعتق وان شاء استرق یعنی میں اس شخص کا
غلام ہوں جس نے مجھے علم دین سے ایک حرف بھی سکھلایا۔
اور اسے اختیار ہے کہ مجھے فروخت کر دے آزاد کر دے
یا اپنی خدمت میں رکھ لے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی اور مقام پہ
گہر بار ہیں: رایت احق الحق حق المعلم،
واوجبه حفظا علی کل مسلم
لقد حق ان یهدی الیه کراما
لتعلیم حرف واحد الف درهم

"یعنی میں نے تمام حقوق سے بڑھ کر استاد کے حق کو
پایا ہے اور اس کی حفاظت ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض
ہے اور استاد کا حق اتنا ہے کہ ایک حرف کے بدلہ ایک ہزار
درہم بھی اس کی نذر کریں تو بھی بہت کم ہے۔"

اس سے بڑھ کر اور کیا جملہ ادا ہو سکتا ہے جو
استاد کے حق کی وضاحت کرے۔ اتنا جاننے کے بعد ہر
شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جائیگا کہ بخدا تمام حقوق پر استاد
کا حق بلند ہے کیونکہ وہ ہمیں گمراہی سے نکال کر کامیابی
کی طرف لے جاتا ہے اور دوزخ کے کُندوں کو جنت
کا مستحق بناتا ہے۔

ایکمرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے لڑکے کو
ایک قابل استاد علامہ اصمعیؒ کے پاس تحصیل علم و ادب
کے لئے بھیجا اور لڑکا علم سے فیضیاب ہونے لگا۔ ایک
وقت خلیفہ کیا دیکھتا ہے کہ لڑکا استاد کے پیر پہ پانی
ڈال رہا ہے اور استاد اپنا پیر دھو رہے ہیں۔ خلیفہ
اس کا مشاہدہ کرنا ہی تھا کہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور
فوراً کہہ اٹھا کہ مولانا! میں اپنے لخت جگر کو بغرض تحصیل
علم وادب کے روانہ کیا ہے اس کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے
بائیں ہاتھ سے پانی ڈالے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنا
پیر صاف کرے یہی ادب کا تقاضا تھا اور اسی طرح
حضرت امام ابوحنیفہؒ سے متعلق کسی نے نقل کیا ہے،
کہ آپؒ نے حضرت شیخ حمادؒ کے حلقۂ تدریس میں دس سال
کی مدت گذار دی۔ کہتے ہیں جب تک شیخ حمادؒ زندہ رہے

اس وقت تک امام ابوحنیفہؒ ان کے گھر کی طرف کبھی پاؤں تک نہیں پھیلائے۔ صحیح معنوں میں یہی استاد کی تعظیم تھی۔

اسی طرح کسی نے حضرت سکندر ذوالقرنین سے سوال کیا کہ آپ کیوں اپنے والدین سے زیادہ استاد کی خدمت اور اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں؟ تو انہوں نے سمجھایا کہ میرے والدین مجھ کو آسمان سے زمین کی طرف لائے ہیں، لیکن استاد کے ذریعہ میں زمین سے آسمان کی طرف جاؤں گا۔ یعنی میں والدین کے ذریعہ عالم ملکوت سے عالم فنا کی جانب اتارا گیا ہوں جس میں خالص فسادات ہیں لیکن استاد کے ذریعہ انسان کی روح عالم فنا سے عالم بقا کی جانب پہنچتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس دنیاوی زندگی سے کوئی رغبت نہیں جو فانی ہے بلکہ ہم ابدی زندگی کے خواہاں ہیں جس میں ہر وقت سلامتی ہے۔

لہٰذا ایک طالب العلم کو چاہیئے کہ وہ ہر حال میں اس کی خوشنودی کا خیال رکھے تاکہ دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں اور بغیر ان کی خوشنودی کے علم کا حاصل ہونا ناممکن و محال ہے اور جو شخص ان کی تعظیم و تکریم بجا نہ لائے وہ علم سے محروم ہو جاتا ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

ان المعلم والطبیب کلاهما
لا ینصحان اذا هما لم یکرما

یعنی معلم اور طبیب یہ دونوں نصیحت نہیں کرتے ہیں جب تک کہ ان کی عزت و وقار کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

شیخ صفی الدین جو اپنے وقت کے ایک بزرگ تھے اکمیرتہ آپ کے استاد نے آپ سے مولی طلب کی۔ رات کا وقت تھا اور مولی کا موسم بھی نہ تھا۔ لیکن استاد کی خدمت کے شوق نے انہیں ابھارا اور وہ اس کی جستجو لگانے پر مستعد ہو گئے۔ چنانچہ خیر آباد (جہاں تعلیم پاتے تھے) کی گلیوں، کوچوں میں مولی تلاش کرنے لگے۔ اور جس گھر پر بھی جاتے اس کو بند پاتے۔ چونکہ رات کا وقت تھا، سب آرام فرما رہے تھے۔ آخر کار جب آپ اس میں ناکام ہوئے تو دل گرفتہ ہو کر رونے لگے۔ کسی نے آپ کی آواز سن کر دوڑ آیا اور پرسان حال ہوا۔ آپ نے اپنی حاجت بیان کی۔ لیکن جس کے جواب میں وہ یہ کہتے ہوئے چپ ہو گیا، کہ نہ مولی کا موسم ہے اور نہ دن کا وقت۔ اتنے میں دو اور آدمی آگئے۔ جس میں ایک بڈھیا نے مولی کا پتہ بتا دیا۔ چنانچہ تینوں صاحب، صاحب مولی کے پاس گئے۔ بیدار کرنے کے بعد اپنا تمام حال دہرایا۔ اس کے سننے پر وہ شخص فوراً دو نہایت عمدہ مولی صاف کر کے آپ کے حوالہ کر دیا۔ پہلے تو استاد کو معلوم ہی تھا کہ رات کا وقت ہے، چنانچہ ناکامی ضروری ہے۔ لیکن جب اس کی کامیابی کا حال ظاہر ہوا تو آپ کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ بات بات پر آپ کی بلائیں لیتے اور دعائیں دیتے تھے آپ کی دعا یہ بھی تھی، کہ جس طرح مولی کی تلاش میں خدا تمہیں ایسی تاریک رات میں کامیاب کیا اسی طرح علم کے میدان میں بھی خدا تم کو کامیاب کرے۔ استاد کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ وہ آئندہ

چل کر ایک بزرگ کہلائے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں ڈھالا ہے ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

شمس الائمۃ الحلوائی کہتے ہیں کہ میں نے علم کو اُستاد کی تعظیم سے پایا۔ ورنہ اس سے محروم رہتا۔ اور امام شمس الائمۃ السرخسی فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بلا وضو کتاب نہیں اُٹھائی۔ یہاں تک کہ اس کے مطالعہ کے لئے ایک رات میں سترہ مرتبہ وضو کرتا تھا۔ دیکھئے کتاب اور علم کی تعظیم کا یہ عالم ہو تو اس کی حقیقت سے روشناس کرانے والے کی تعظیم و تکریم کس طرح نہیں ہونی چاہیئے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں استاد کی تعظیم و توقیر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اللّٰھم اغفرلی ولوالدیّ ولاستاذی ولجمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات برحمتك یا ارحم الراحمین۔

انتخاب از
سید دستگیر پاشا عدوس
منکولی بیجاپور
متعلم
دارالعلوم لطیفیہ
حضرت مکان۔ ویلور
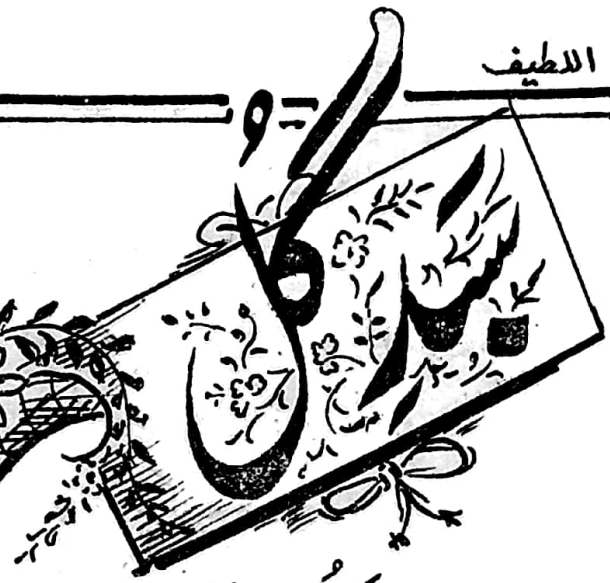
حفاظت جن سفینے کی انہیں منظور ہوتی ہے،
کنارے تک اسے خود لاکے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں
(مخمور دہلوی)

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
نامعلوم

وہی تو گل کے تبسم کا راز سمجھیگا۔
تمام عمر جو رویا ہو اک ہنسی کیلئے
نامعلوم

قسمت کی خوبی دیکھیئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا
نامعلوم

جادۂ زیست میں بکھرے ہوئے راہی ہیں بہت
دیکھیئے پھول بھی شاید انہیں خاروں سے ملے
نامعلوم

کیا تماشہ ہے کہ آئے ہیں تسلی دینے
وہ جنہیں دردشناسی کا سلیقہ بھی نہیں

خلوص دل سے نہ ہو تو فضول ہے سجدہ
ادب سے ہو تو خطا بھی ثواب ہو جائے۔
نامعلوم

میں مسافر ہوں بہت دور مجھے جانا ہے
زلف کی چھاؤں میں کچھ دیر ٹھہر جانے دو
بیتاب

جہاں پلکوں کے سایہ میں ہزاروں فتنے سوتے تھے
وہیں فطرت نے چپکے سے نگاہِ شرمگیں رکھدی
اثر

روش روش کو سنوارا ہے خون سے جس نے
اسی کے رہنے کا گلشن میں انتظام نہیں

وہ رازِ گلشن ہستی سمجھنے بیٹھے ہیں
جنہیں خبر نہیں خود اپنے آشیانے کی
سعادت نذیر

پسینہ موت کا ماتھے پہ آیا آئینہ لاؤ
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھینگے
نامعلوم

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کردئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا۔
اصغر گونڈوی

پڑھی نماز جنازہ کی میری غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے
نامعلوم

نہیں ہے قدر زمانے میں صاف گوئی کی
یہ تلخ گھونٹ کسی سے پیا نہیں جاتا
حامد

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ آجکل ایک نئے قسم کا پستول ایجاد ہوا ہے جس سے فیر کرنے سے ڈھائی اِنچ لمبی برچھی باہر نکلتی ہے۔ مدراس کارپوریشن والوں کا ارادہ ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے اس کی پیشانی پہ پستول سے فیر کیا جائے جس سے وہ جانور بیہوش ہوجاتا ہے اس کے بعد شرعی طریقہ پر مسلمان اس کو ذبح کریں۔ ان کا کہنا ہے اس طریقے پر ذبح کرنے سے جانور کو تکلیف نہ ہوگی اور خون بھی بہت جاری ہوگا اور گوشت زیادہ دنوں تک اچھی حالت میں رہ سکتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طریقہ پر ذبح کرنا اور اس کا گوشت استعمال کرنا کیسا ہے؟ ازروئے شرع مدلل بیان عنایت فرمادیں۔

السائل ڈاکٹر سید خلیفۃ اللہ صاحب۔ مدراس

الجواب

اللّٰھم ھدایۃ الحق والصواب

درصورت مسئولہ جو طریقہ مروج کرنا چاہتے ہیں، اس طریقہ پہ ذبح ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ سنت کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اولاً ذبح سے پہلے اور ذبح کے بعد جانور ٹھنڈا ہونے تک اس کو کسی قسم کی اذیت پہنچانا مکروہ ہے۔ ثانیاً ذبح کرتے وقت جانور میں حیاتِ مستقرہ ہونا شرط ہے۔ بغیر اس کے ذبح بالکل درست نہیں ہے۔ مذکورۂ بالا طریقہ پہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ کیونکہ جانور بیہوش ہونے کے بعد حیاۃ مستقرہ کا پایا جانا مشتبہ امر ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں ہے وکرہ کل تعذیب بلا فائدۃٍ الخ (بحر الرائق)

ومنھا ای من الشرائط قیام اصل الحیاۃ فی المستأنس وقت الذبح قلت اوکثرت فی قول ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ، وعند ابی یوسف ومحمد رحمھم اللہ اجمعین، لایکتفی بل تعتبر حیاۃ مستقرۃ کذا فی البدائع (عالمگیری)

جانور میں ذبح کے وقت اصلی حالت پائی جائے، جب جانور کو بیہوش کیا جاتا ہے تو اس پہ غنودگی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں حیوٰۃ مستقرہ کا ہونا مشتبہ ہوجاتا ہے۔ ھکذا فی کتب الفقہ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ ابوالمعالی مولوی علوی صاحب
مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان
ویلور قدس سرہ العزیز

اسلام میں ملوکیت کی ابتدا

از
سید محبوب باشاہ
عیدروس منگولی (بیجاپور)
متعلم زمرۂ خا دارالعلوم لطیفیہ حضرتؒ مکان
ویلور

خالق اکبر نے بیشمار مخلوقات کو اس روئے زمین پہ پیدا فرمایا۔ جن کا شمار عقل انسانی سے کوسوں دور ہے لیکن آج کے اس سائنٹفک دور میں کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ اس میں کسی نہ کسی قسم کے حیوانات یا نباتات یا اور کسی قسم کی مخلوقات کی تحقیق نہ کی جاتی ہو۔ تاہم عقل انسانی ان تمام مخلوقات کے ادراک سے عاجز ہے خدائے برتر کے ان اَن گنت مخلوقات میں اگر کسی کو برتری و شرف و بزرگی حاصل ہے تو وہ صرف بنی نوع انسان کو ہے، جس کی بزرگی وبلندی کے بارے میں خود خالق کائنات نے فرشتوں سے کہا تھا (انی اعلم مالا تعلمون) یہ حقیقت ہے کہ خدا کی خلافت کا سہرا انسان ہی کے سر ہے اور یہ تاج سروری صرف انہیں افراد کے زیب سر رہا ہے جو اس کے اطاعت شعار بندے تھے۔

خالق کائنات نے اپنی اس عظیم مخلوق کو راہ راست پہ لانے اور اسے گمراہی سے بچانے کی خاطر ہر دور میں کسی نہ کسی کو رہبر مقرر فرمایا اور وحی کے ذریعہ اس کی رہنمائی کی۔ انہیں ہادیان اسلام میں سے ہادئ اعظم جنہیں ہم سرور کائنات شفیع المذنبین رہبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں مبعوث فرما کر شہنشاہی کا تاج عطا کیا۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا اکثر حصہ حکومت وجہانبانی میں گذرا۔ آپ کی حکمرانی کی بنیاد قانون خداوندی کے اس اساس پہ رکھی گئی تھی کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور اہل ایمان کی حکومت دراصل خلافت ہے۔

خلیفۂ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ

محبوب خدا خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت کے لئے سب سے پہلا مسئلہ مسئلۂ خلافت درپیش آیا۔ اسلامی نظام کو قائم رکھنے اور اس کے احکام کو پورا کرنے کے لئے فوری طور پہ کسی نہ کسی کو خلیفہ مقرر کرنا نہایت ضروری امر تھا، اور یہ کام حضرت عمرؓ کے انتخاب ورائے عامہ کے ذریعے طے پایا اور سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ نہایت خداترس اور رعایا نواز حکمران گذرے ہیں۔ آپ اپنے دس سالہ دور حکومت میں ایسے ایسے کارنامے انجام دئے، جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ آپ اپنی حکمرانی صرف دو چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے چلاتے رہے جس میں ایک قرآن حکیم ہے اور دوسرا آپؐ کی وہ مقدس زندگی جس میں آپ رضؓ نے ہمیشہ زندگی کی سچی تصویر دیکھی تھی۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی وفات کے وقت حضرت عمر فاروقؓ کے حق میں وصیت لکھوائی اور مسجد نبویؐ میں لوگوں کو جمع کر کے کہا کیا تم اس شخص پہ راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں؟ خدا کی قسم میں نے رائے قائم کرنے کے لئے اپنے ذہن پہ زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتے دار کو نہیں، بلکہ عمر ابن الخطاب کو جانشین مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔ (تاریخ الامم والملوک)

وصیت کے مطابق لوگوں نے آپ کو حضرت ابوبکرؓ کے بعد امیر المومنین منتخب کیا اور آپ کے دست پر بیعت کی۔ بائیس جمادی الثانی ۱۳ ہجری سے آپ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ ناقابلِ فراموش دور ہے جو از ابتدا تا انتہا بے شمار محاسن و خوبیوں کا حامل ہے، تاریخ اسلام میں ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ

حضرت عمرؓ کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف کی کوشش اور رائے عامہ کی اکثریت کا اعتبار کرتے ہوئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے۔ چوبیس ہجری سے آپ کی خلافت شروع ہوتی ہے۔ خلافت عثمانیہ پانچ چھ سال نہایت امن و سکون و راحت میں بسر ہوئے۔ فتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی زیادتی اور تجارت کی ترقی نے ملوک کو فارغ البالی اور عیش و تنعم کے سامان سے مامور کر دیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے لازمی نتائج بھی ظہور پذیر ہونے لگے۔ منافقین اور باغیوں نے حضرت عثمان کی نرمیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ کے اطراف شورشوں کا ایک جال تن دیا یہاں تک کہ ایک دن اس فتنہ نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اسی فتنہ نے حضرت علی کو دم لینے نہ دیا۔ اور حضرت حسنؓ کے نرم و نازک جگر کو روزن دان بنا دیا۔ یہی شورش آگے چل کر اسلامی حکومت (خلافت) کو ملوکیت کی جانب لے جانے کی اصل بنا قرار پائی۔ جب شورشوں نے کاشانۂ خلافت کا سختی سے محاصرہ کیا تو چند جاں نثاروں نے آپ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ اگر آپ کا حکم ہو تو ہم اپنی جان کی بازی لگا دیں گے۔ یہ سن کر حلم و بردباری کے اس پیکر اعظم نے جواب دیا کہ میں اپنی خاطر آپ لوگوں کو کبھی ایسا حکم نہ دوں گا۔ پھر بھی حضرت امام حسنؓ، ابن عباس، محمد بن طلحہ اور عبداللہ بن زبیرؓ واپس نہ گئے۔

حضرت عثمان غنیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اپنی شہادت کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ بنا بریں آپ فوراً نہا دھو کر تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول ہو گئے۔ باغیوں نے موقعہ پا کر آپ کو اسی حالت میں شہید کر ڈالا۔ آپ کی وفادار بیوی نائلہؓ مدافعت کی بہت کچھ کوشش کی، یہاں تک کہ دورانِ مدافعت آپ کی تین انگلیاں بھی شہید ہو گئیں۔

خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ

حضرت عثمانؓ کی وفات

کے بعد کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو آپ نے فرمایا تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے یہ تو اہلِ بدر و شوریٰ کا کام ہے۔ یہ لوگ جسے خلیفہ منتخب کریں وہی خلیفہ ہوگا۔ بالآخر بعد اصرار بسیار کے اُمتِ مسلمہ کے مفاد کی خاطر آپ نے منظور فرمالیا اور لوگوں نے مجموعۂ عام میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں مدینہ کے تمام ممتاز صحابہ بھی شریک رہے۔

پینتیس ہجری سے آپ کا دَورِ خلافت شروع ہوتا ہے۔ بیعتِ عام کے بعد منبر پر کھڑے ہوکر آپ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں مسلمانوں کو راہِ راست پر چلنے اور اس فتنے سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی، نیز تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنانے کی جانب اُن کی توجہ کو مبذول فرمایا۔ بعدِ خطبہ مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ حدودِ شرعیہ کو برقرار رکھیں، لہٰذا جو لوگ خلیفہ کے قتل میں شریک ہوئے ہیں اُن سے قصاص لیا جائے۔ جواب میں آپ نے کہا میں خوب جانتا ہوں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ لوگ ہم پر غالب ہو رہے ہیں جب تک ہم مغلوب۔ اُن سے کیونکر بدلا لیا جائے۔ ہاں میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ باغیوں نے جو کام کیا ہے وہ بلاشبہ جاہلیت کا فعل ہے۔ حالات پر قابو پا لینے دو، پھر قصاص کا مقدمہ دائر کرلینا۔

حضرت علیؓ کا پہلا اقدام

زمامِ خلافت ہاتھ میں آتے ہی آپ نے سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے عہد کے والیوں کی معزولی کا فرمان لکھوایا۔ اور ان کی بجائے دوسرے لوگوں کو مقرر کرکے روانہ کیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ جو مدبّرینِ عرب میں ممتاز خیال کئے جاتے تھے، آپ کو اس امر سے روکنے کی کوشش کی۔ نیز آپ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ جنہوں نے اس کے انجام کو بھانپ لیا تھا وہ بھی آپ کو اس فعل سے باز رکھنا چاہا لیکن آپ نے نہیں مانا۔ غالباً آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ امراء اس قابل نہیں ہیں کہ ایک دن بھی والی رکھے جائیں۔ لہٰذا اسی خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے نئے امراکو ان کی جگہ مقرر فرمادیا۔ عثمانؓ بن حنیف کو بصرہ۔ عمارہ بن شہاب کو کوفہ، عبیدؓ بن عباس کو یمن، قیسؓ بن سعد بن عبادہ کو مصر اور سہیل بن حنیف کو شام کی امارت کا فرمان دے کر روانہ کیا۔ سہیل جس وقت تبوک پہنچے تو شامی سواروں کا دستہ ان کے سامنے آیا اور پوچھا آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ انہوں نے کہا میں خلیفہ کی جانب سے شام کا امیر مقرر ہوا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا اگر حضرت عثمانؓ نے آپ کو بھیجا ہے تو بخوشی تشریف لائیے ورنہ واپس جائیے۔ (تاریخ الامت)

حضرت امیر معاویہ کا انکارِ بیعت و اعلانِ مخالفت

حضرت علیؓ کے اقدام پر جو نتیجہ برآمد

ہونے والا تھا اس کو مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عبداللہ بن
عباسؓ نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا چنانچہ ہوا بھی ایسے ہی،
تمام اسلامی صدر مقامات میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔
حضرت امیر معاویہ والیٔ شام جو بنی امیہ کے رئیس اعظم
تھے حضرت علیؓ کی خلافت پر رضا مند نہ ہوئے۔ چونکہ آپ
حضرت علیؓ کو شہادتِ عثمان کے حادثہ میں متہم سمجھتے
تھے اور جب آپ کو یہ خبر ملی کہ حضرت علی نے قاتلین
عثمان کا قصاص نہیں لیا ہے تو اس تہمت کو اور تقویت
پہنچی۔ حضرت علی کا آپ کو والیٔ شام سے برطرفی کا حکم
ملنا اس چیز نے انہیں اور صدمہ پہنچایا۔ آپ جان گئے
کہ اگر میں خلافت تسلیم کر لوں تو اس کا نتیجہ میرے
حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ادھر حضرت علی اس کوشش میں
تھے کہ کسی نہ کسی طرح بیعت ہو جائے۔ اور ایک دل
ہو کر تمام مسائل حل کئے جائیں۔ چنانچہ پھر آپ نے ایک
مرتبہ سبرہ جہنیؓ کو ان سے بیعت لینے کے لئے بھیجا لیکن
امیر معاویہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عثمان غنی
کے قتل کے تیسرے مہینے اعلانِ مخالفت کے لئے بنی عبس
کے ایک شخص کو ایک کورہ کاغذ دیکر روانہ کیا جس
میں نیچے ان کی مہر لگی ہوئی تھی اور مضمون صرف یہ
لکھا ہوا تھا (من معاویہ الی علی)
یکم ربیع الاول ۳۶ ہجری عبسی مدینہ میں داخل ہوا
لوگوں نے عبسی کے ہاتھ امیر معاویہ کا کورہ کاغذ پھر اس
پر ان کی لگی ہوئی مہر دیکھ کر اس واقعہ کی خبر حضرت
علیؓ کی خدمت میں پہنچا دی۔ آپ نے عبسی کو بلا کر معاملہ
کی تحقیق کی۔ عبسی نے کہا دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر خلیفہ
مقتول کا خون آلود پیراہن اور نائلہ کا کٹا ہوا ہاتھ رکھا
ہوا ہے اور ساٹھ ہزار آدمی ان کا ماتم کر رہے ہیں۔ یہ
لوگ آپ کو اس وقت تک خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے جب
تک کہ آپ قاتلین عثمان سے قصاص نہ لیں۔

جنگِ جمل و صفین

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہٗ شام
پر لشکر کشی کی تیاریوں میں
مصروف تھے کہ اسی اثنا میں بصرہ کے اجتماع کی خبر نے
آپ کو بصرہ کی جانب متوجہ کر لیا۔ حضرت علیؓ مدینہ سے
ایک لشکر کثیر لے کر کوفہ کا رخ کیا۔ راستے میں مقام زبذہ
پہنچکر آپ نے کوفہ سے امدادی فوج طلب کر لی۔ بصرہ
میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ پہلے پہل تو جانبین سے
سفیروں کی آمد و رفت نے ایک دوسرے کو بالکل قریب
و ہمخیال بنا دیا تھا۔ مگر سبائی جماعت جس کو شورش
برپا کرنے میں کامل دسترس حاصل تھی صبح ہونے سے
پیشتر ہی دونوں فوجوں میں جنگ کی آگ سلگا دی۔
صبح ہوتے ہی میدان کارزار گرم تھا۔ ادھر حضرت
طلحہؓ و زبیرؓ اس غلط فہمی میں تھے کہ یہ کام حضرت علیؓ
کا ہے، ادھر حضرت علی اس غلط فہمی میں تھے کہ اس
آگ کو طلحہ و زبیر نے لگائی ہے۔ آخر کار حضرت علیؓ
کی تدبیر پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اونٹنی کے پیر کو
زخمی کیا گیا جس کی وجہ سے وہ بیٹھ گئی۔ اونٹنی کا بیٹھنا ہی

ہی تھا کہ جنگ دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔

یہی وہ پہلی جنگ تھی کہ جس میں ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے سامنا کیا۔ اس جنگ میں تقریباً نو ہزار آدمی جانبین سے شہید ہوئے۔ دوسرے دن حضرت علیؓ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملہ کو سلجھا لیا پھر آپ نے حضرت عائشہؓ کو نہایت احتیاط سے رخصت فرمایا۔

جنگِ جمل جنگ صفین کے لئے ایک دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگِ جمل سے فراغت پاکر آپ نے پھر ایک بار سبز و جہنی کے ہاتھوں ایک خط دیگر امیر معاویہ کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ وہ بیعت لے لیں لیکن اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ حضرت امیر معاویہ جو ایک زمانہ سے دمشق پر اپنا تسلط حاصل کر چکے تھے ان کے پاس بے شمار جنگ آزمودہ فوج موجود تھی، لہٰذا وہ اسی قوت کی بنا پر حضرت علی کی خلافت تسلیم کر لینے سے کر دیا۔ اب حضرت علیؓ کے لئے بجز لشکر کشی کے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ آپ نے فوج لے کر شام کا رخ کیا۔ مقام رقہ پہنچکر دریا عبور کیا، ادھر حضرت امیر معاویہؓ کی فوج موجود تھی۔ پہلے ان دونوں میں جھڑپ ہوئی۔ پھر معاملہ تھم گیا۔ یہاں بھی صلح کے امکانات نظر آرہے تھے۔ مگر وہی سبائی جماعت، جو ان دونوں کے اتحاد کو اپنے لئے پیغام موت تصور کرتی تھی۔ اس جنگ میں بھی وہی کردار ادا کیا جو جنگِ جمل میں ادا کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میدان کارزار گرم نظر آرہا تھا۔ یہ جنگ شام تک برابر جاری رہی، دوسرے روز قریب تھا کہ شامی فوج شکست کھا جائے۔ مگر عمرو بن العاصؓ کی سیاسی تدبیر کام آئی۔ شامی فوج نیزوں پر قرآن اٹھائے میدان میں آئی یہ دیکھ کر حضرت علیؓ کی فوج جنگ سے رک گئی اور کہنے لگی ہم ان سے جنگ نہیں کر سکتے جو قرآن کے تحت معاملہ کا فیصلہ چاہتی ہو۔ بہرحال جنگ رک گئی اور جانبین سے دو ثالث مقرر کئے گئے۔ ان دونوں حاکم کو جانبین سے پورا پورا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جسے چاہیں خلیفہ برقرار رکھیں اور جسے چاہیں برطرف کر دیں۔ دونوں حاکم مدتِ معینہ تک ہر روز تبادلہ خیال کرتے رہے۔ آخرکار اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ حضرت علی خلافت کے اہل ہیں اور نہ حضرت امیر معاویہ، لہٰذا میں میرے خلیفہ کو برطرف کر دوں گا اور آپ اپنے خلیفہ کو برطرف کر دیں۔ اس تجویز پر دونوں ثالث برابر کے شریک تھے۔ اس قرارداد کے بعد دونوں حاکم فیصلہ سنانے کے لئے دومۃ الجندل آئے یہ فیصلہ امت کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ اس لئے ہزاروں مسلمان اور بے شمار اکابر صحابہ جو اس جنگ میں غیر جانبدار تھے فیصلہ سننے کے لئے آئے۔ غرض مقررہ تاریخ پر دونوں حاکموں نے جامع مسجد میں فیصلہ سنایا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ پہلے تم فیصلہ سناؤ۔ انہوں نے کہا آپ منقبت میں مجھ سے افضل ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے میں اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوموسیٰؓ آپ کے نرم میٹھی باتوں میں آگئے۔ چنانچہ منبر پر کھڑے ہو کر فیصلہ کا اعلان کیا۔ "اما بعد! لوگو ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا، اس امت کے اتحاد و اتفاق اور اصلاح کی اس کے علاوہ اور کوئی

صورت نظر نہیں آئی کہ علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر کے خلافت کو شوریٰ پہ چھوڑ دیا جائے۔ عام مسلمان جسے اہل سمجھیں اُسے منتخب کر لیں۔ اس لئے میں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کرتا ہوں۔ آئندہ تم جسے چاہیں اپنا خلیفہ بنا لو۔" آپ کے بعد عمرو بن العاصؓ نے فیصلہ سنایا۔

"اما بعد لوگو! ابوموسیٰؓ کا فیصلہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی کو معزول کر دیا میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں، لیکن اپنے آدمی معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں، وہ امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے ولی اور قصاص کے طالب ہیں اس لئے ان کے قائم مقامی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔"

اس کا سننا ہی تھا کہ حضرت ابوموسیٰؓ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور چلائے کہ یہ کیا غدّاری ہے۔ اس فیصلہ سے قدرتاً حضرت علیؓ کے حامیوں میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ شریح بن ہانی نے عمرو بن العاص پہ کوڑے برسانا شروع کر دئے لیکن لوگوں نے درمیان میں پڑ کر چھڑا دیا۔ شامی حضرت ابوموسیٰؓ کی تلاش میں تھے وہ یہ رنگ دیکھ کر مکہ نکل گئے۔ اس فیصلہ کے بعد امیر معاویہؓ کے حامیوں نے انہیں باضابطہ خلیفہ تسلیم کر لیا۔ (تاریخ اسلام)

لیکن حضرت علیؓ اس فیصلہ پہ راضی نہ ہوئے۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ قرآن و حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں بلکہ سیاسی معاملات و ذاتی اغراض کے تحت کیا گیا تھا۔

مُلوکیت کا آغاز

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد اہل کوفہ کے اصرار پہ امام حسنؓ نے خلافت کو قبول فرما لیا لیکن حضرت معاویہؓ جو برسوں سے شام پہ اپنا اثر جمائے ہوئے تھے، ان کے سامنے آپ کی خلافت زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکی۔ شامی فوجوں نے کوفہ پہ لشکر کشی کی تو امام حسنؓ کی فوج پہلے ہی حملہ میں پسپا ہو گئی اور بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ حضرت امام حسنؓ جو سینے میں ایک درد مند دل رکھتے تھے اس خونریزی کو پسند نہ فرمایا اور چند شرائط پہ امیر معاویہ سے صلح کر لی۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے خلافت نے ملوکیت کا جامہ پہن لیا۔

جنگ صفین میں عمار بن یاسرؓ کی شہادت نے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ امیر معاویہ غلطی پہ ہیں نیز امام حسنؓ نے دست برداری کا اعلان کیا تو اہل بصیرت سمجھ گئے کہ اب ہم کو ملوکیت سے سابقہ در پیش ہے۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص نے جب حضرت امیر معاویہ سے ملاقات کی تو السلام علیك ایها الملك کہا اس پہ حضرت امیر معاویہ نے کہا، آپ ملک کے بجائے امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا۔ آپ نے کہا یہ خلافت جس طرح آپ کو حاصل ہوئی ہے اگر مجھے ملی ہوتی تو میں اس کو ہرگز ہرگز تسلیم نہ کرتا۔

ایک دوسرے موقعہ پہ حضرت امیر معاویہ اپنے بادشاہ ہونے پہ خود اس طرح کہتے ہیں انا اول الملوك

فوائد ملوکیت

بلا شبہ دَور ملوکیت میں بے شمار کارنامے انجام پائے جو تاریخ میں آپ اپنی مثال ہیں۔ حضرت

امیر معاویہ جو مدبرین عرب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں آپ ہی کی تحریک پر حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ میں بحری بیڑا وجود میں آیا اور یہاں تک کہ ایک دن یہ فوج اتنی ترقی کی کہ قبرص پر مسلمانوں نے بیک وقت پانچ سو جہازوں سے حملہ کیا۔ آپ کے زمانے میں بحری فوج میں اور بھی زیادتی ہوئی اور جگہ جگہ جہازسازی کے کارخانے قائم ہوئے۔ بحر روم گویا ان دنوں میں مسلمانوں کے لئے بازی گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے کہ ڈاک کا کارنامہ بھی قابلِ درج ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ڈاک کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ اپنے دور میں مختلف مقامات پر تیز رفتار گھوڑے مقرر کر رکھے تھے اور سرکاری کارندوں کو حکم دیا گیا تھا کہ خبر رسانی کا کام ان گھوڑوں سے لیا جائے۔

حضرت امیر معاویہؓ آپ ایک صحابی ہونے کی حیثیت سے دنیوی کاموں سے بھی بے بہرہ نہ رہے۔ آپ کے دور میں شمالی افریقہ کے بربری بغاوت کے ساتھ ساتھ مرتد بھی ہو جایا کرتے تھے۔ آپ نے قراوان بنا کر اس کا تدارک کیا۔ اسلامی تاریخ آپ ہی کے زمانے میں مدوّن ہوئی۔ آپ سے پہلے اسلام میں تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ کو دوسری قوموں اور پھر اپنے مذہب کی تاریخ پڑھنے اور سننے کا انتہائی شوق تھا۔ اسی شوق کی بنا پر آپ کے زمانے میں تاریخ مرتب کی گئی۔ اجتماع علوم وفنون میں امیر معاویہ کے بعد خالد کا نام کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ نہایت ذہین اور ذی علم شخص گذرا ہے۔ اس نے عیسائی حکما و اطباء سے علم طب وغیرہ کی تحصیل کی اور خود اس فن میں کئی کتابیں تصنیف کی۔

خلفائے عباسیہ

بنو امیہ کے بعد خلفائے عباسیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ عباسیہ کا پہلا دور جو ایک سو تینتیس ۱۳۲ سے لیکر ۲۳۲ سنہ تک رہا، وہ نو خلیفہ پر مشتمل ہے۔ یہ ایسا ناقابلِ فراموش دور ہے جس کو تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ سفّاح، منصور، مہدی، ھادی، ہارون، امین، مامون، معتصم، واثق۔ یہ ایسے ذی علم خلفاء گزرے ہیں جو اپنے دور میں دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ دینی وعلمی خدمات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور کو علم وادب کی روشنی سے منور کیا اور اپنی زندگیاں علوم کو جمع کرنے میں صرف کر دیں۔

خلفائے اندلس

اسپین کا عہدِ حکومت پورے برِ اعظم یورپ کی تاریخ کا ایک زرین باب مانا جاتا ہے۔ تقریباً آٹھ سو سال تک اسپین پورے برِ اعظم کے لئے تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنا رہا۔

فاتحین سپین نے سرزمین اسپین کو علم وادب کی روشنی سے چمکا دیا۔ چنانچہ قرطبہ وغیرہ میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں جہاں انگلینڈ، جرمن، جاپان اور افریقہ سے تشنگانِ علوم آ آ کر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔

نقائص ملوکیت

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ جس چیز میں فائدے ہوں اس میں کچھ نہ کچھ نقصانات کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اسلامی

حکومت یعنی خلافت میں خلیفہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ
وأمرهم شوریٰ بینهم کے تحت خلیفہ بنا ہو۔
اور خلیفہ بننے میں ذرا برابر بھی کوشش نہ کی ہو لیکن
ملوکیت کا آغاز اسی بنیادی تبدیلی سے ہوا۔ لہٰذا
خلافت شخصی وموروثی کہلانے لگی۔ اس دور میں خلفاء
وامراء کے بارے میں کسی کو ان کی غلطی پر اعتراض، یا
سرزنش کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ اس فعل کو معزز، اور
عمر رسیدہ صحابہؓ اپنے نزدیک ایک جرم تصور کیا کرتے
تھے۔ اسی لئے امراء کی لغزشیں روز بروز بڑھتی گئیں
یہاں تک کہ انہوں نے حدودِ شرعیہ میں بھی کمی بیشی
کرنے سے گریز نہ کیا۔

قانونِ فطرت جس کا خلافت راشدہ میں کما حقہٗ
لحاظ کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ حضرت عثمان غنیؓ اپنے
انتہائی اشتعال انگیز حالت میں بھی قانونِ شرعیہ سے
ایک قدم باہر نہ رکھا۔ آپ کے نزدیک امیر، غریب عجمی
عربی ایک ہی مقام رکھتے تھے مگر ملوکیت میں یہ بات
نہ رہی۔ امراء ورؤساء اور شہزادے اس قانون سے
بالاتصور کئے جاتے تھے۔ ان کی غلطیاں درگزر کر دی
جاتی تھیں اور ان کی لغزشوں پر بازپرس بھی کما حقہٗ
نہیں ہوا کرتی تھی، اس سے ملوکیت کو فائدہ تو ضرور پہنچا
مگر رعایا پر یہ ایک ظلم کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہٰذا عوام اس
فعل سے ناراض تھے۔ اس کے علاوہ دورِ ملوکیت میں
خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ کہ
آغازِ ملوکیت ہی سے خلفاء اپنے لئے بادشاہی طرز اختیار
کر لئے تھے، وہ اپنے لئے عالیشان محلات بنوائے، اور
بیت المال جو خلفائے راشدین کے دور میں رعایا کی
ملکیت تصور کیا جاتا تھا اس تصور پر ان کے اس تصور
نے پردہ ڈال دیا۔ خزانہ بادشاہ کی ملکیت ہے اور رعایا
صرف اس کی باجگذار ہے۔ لہٰذا اسے اپنے خلیفہ سے
حساب وکتاب کے پوچھ کا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر قضاوت
کے معاملہ میں بھی تبدیلی واقع ہوئی، بعض خلفائے
راشدین اپنے دور میں خود قاضی مقرر کیا کرتے تھے اور
ان کو پوری پوری آزادی دی جاتی تھی کہ وہ جس کے بھی
حق میں ہوں احکام شرعیہ کے مطابق صحیح صحیح فیصلہ صادر
کر دیں، اگرچہ خلیفہ بھی کیوں نہ ہو۔ مگر دورِ ملوکیت میں
یہ چیز باقی نہ رہی۔ قضاء، امراء وشہزادوں کے خوف سے
صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ اور جو قاضی احکام شرعیہ کے
تحت کسی خلیفہ کے حق میں اس کی امید وآرزو کے خلاف
فیصلہ دیتا تو اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی۔ یہاں تک
کہ اہل علم منصبِ قضاوت سے گھبراتے تھے اور اس دور
میں جو قاضی بنتا تھا وہ مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

ملوکیت کی ان تبدیلیوں کی بنا پر احکام شرعیہ
دنیوی کاموں میں رکاوٹ پائی جانے لگی۔ اور انہیں تبدیلیوں
کی وجہ سے خلافت کی اصل روح ختم ہو گئی جس سے صرف اس کا
ڈھانچہ باقی رہا۔ بعض اوقات اس ڈھانچے پر شدید ضربیں
لگیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

از نصیر پرواز

نعت
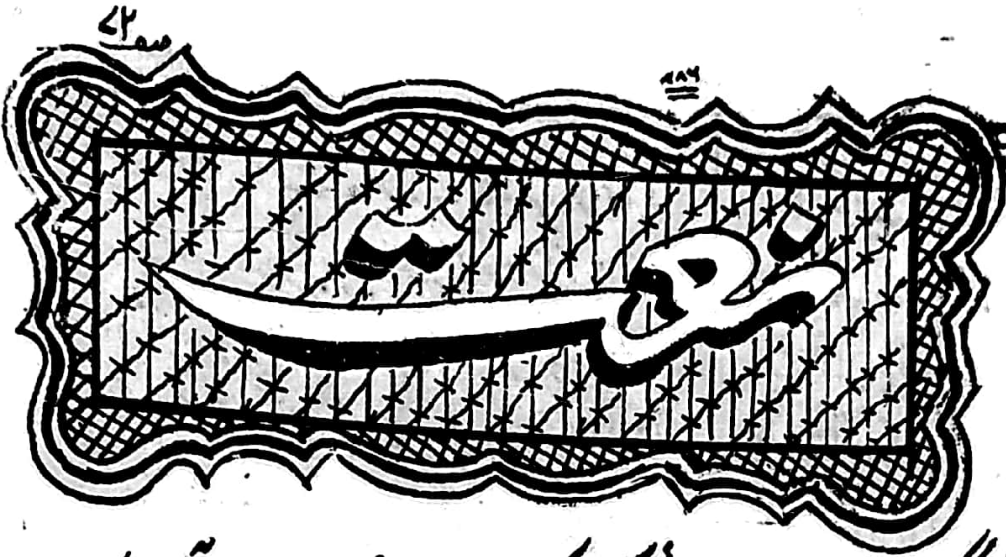
دلنشیں، دلشاد، دل آگیں و دلبر آپؐ ہیں
کتنے پاکیزہ مقدس روح پرور آپؐ ہیں

دافعِ قحط و وبا ہیں صاحبِ تاج و علم
رونقِ معراج خوشبوئے معطر آپؐ ہیں

آپ کی فطرت نگہبانی، کرم بخشش عطا
ہر مصیبت میں شریکِ غم برابر آپؐ ہیں

آپ مطلوبِ جہاں ہیں آپ مقصودِ حیات
اس کو سب کچھ مل گیا جسکو میسر آپؐ ہیں

آپؐ ہیں صدر العلیٰ نور الہدیٰ کہف الوریٰ
عالمِ کون و مکاں میں سب سے بہتر آپؐ ہیں

رحمۃ للعالمیں جنت مکیں انوارِ دیں
آرزوئے ربّ کعبہ پر نچھاور آپؐ ہیں

آپ کی منزل سرِ افلاک سدرۃ المنتہیٰ
آسماں بنکے قدم چومے وہ پیکر آپؐ ہیں

نام جن کا صفحۂ لوحِ ازل پر نقش ہے
وہ شفیع المذنبیں وہ نازِ داور آپؐ ہیں

وہ عرب ہو یا عجم، تحت الثریٰ عرش بریں
ہر جگہ پرواز کے داتا منور آپؐ ہیں

پیش کش عالیجناب حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی
ناظم دار العلوم لطیفیہ

مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جن کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں فانی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام تو ہے جاوداں تو ہے

اس مادرِ گیتی میں کئی مذاہب جنم لئے اور دنیا کو اپنی تہذیبوں سے روشناس کیا، مگر اسلام نے کائنات کو ایک ایسی ہمہ گیر و جامع تہذیب کا درس دیا جس کی مثال آج تک دنیا پیش نہ کر سکی، یہی وجہ ہے کہ غیر اقوام نے بھی اسلام کی خوبیوں کے آگے سر خم کیا۔ اسلامی تہذیب نے حیاتِ انسانی کے خارجی پہلو پر ہی خامہ فرسائی نہیں کی بلکہ باطنی پہلو کو بھی بہت حد تک اجاگر کیا ہے۔ خارجی پہلو یعنے دنیوی زندگی کیسے بسر کرنی چاہیئے اور باطنی یعنی اخروی زندگی کیسے سنواری جاسکتی ہے۔ باطنی زندگی سے مراد تزکیۂ نفس، اعمالِ صالحہ، تدبیر و تحکم، یہ اصول باطنی زندگی کی لوازمات میں سے ہی نہیں بلکہ قوم کے ہر فرد کے حق میں جزء لاینفک ہیں۔

اور باطنی زندگی کی ضرورت خلافتِ راشدہ تک محسوس نہ ہوئی۔ مگر جب دورِ اموی آیا تو یہ چیزیں دو شکلیں اختیار کر لیں۔ ایک شکل حکمران، اور دوسری اہل علم

حکمرانوں نے زمامِ سلطنت تھامی اور اہل علم و صلحائے کرام نے علمی و اخلاقی اور روحانی نشو و نما کی باگ ڈور سنبھالی اور دورِ عباسیہ میں بھی حکمرانوں اور علمی طبقوں میں یہ چیز ترقی پذیر رہی۔

تذکرۃ السلوک میں ہے کہ "تابعین کے بعد جماعت مسلمہ مختلف طبقوں میں بٹ گئی، ہر طرف تفرقہ بندیاں شروع ہو گئیں۔ ہر ایک نے زہد و تقوی کا دعوی شروع کیا تو ان میں خواص اہل سنت جو اپنی جانوں کی مراعات اللہ کے ساتھ کرتے تھے اور دلوں کو راہِ عقل کی چون و چرا سے الگ رکھتے تھے تصوف کے نام سے منفرد ہو گئے۔ اور دوسری صدی ہجری میں یہ نام شہرت پکڑ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ تصوف آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم و صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں موجود تھا۔ گو اس وقت میں نہ اس کا علٰحدہ نام تھا اور نہ صورت تھی، جو تبع تابعین کے بعد ہوئی۔ صوفیائے کرام کا آغاز کہاں ہوا تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں ایسی بابرکت ہستیاں موجود تھیں،

جنہیں لوگ صوفیاء کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ تیسری
اور چوتھی صدی ہجری میں یہ فن تصوف بلندیوں پر رہا۔
اور صوفیاء نے تبلیغی رنگ دیگر عالم اسلامی میں اس کی
ترویج و اشاعت کی اور معرکۃ الآرا تصانیف مرتب
کیں۔ چوتھے دور کے متعلق صاحب لمعات لکھتے ہیں،
کہ ان بزرگوں کے طفیل مبدء اول یعنی خدائے تعالےٰ
تک پہنچنے کا راستہ قریب ہوگیا۔ اور ان کے فیوض و
برکات کے انوار سے عالم علوی سفلی کی فضا مستنیر
ہوگئی۔

تصوف کی وجہ تسمیہ

صوفی منسوب بصوف ہے
اس لئے کہ زمانۂ سابقہ
میں اہل باطن غایت انکسار سے صوف کا لباس پہنتے
تھے۔ صُوف بضمۂ صاد مہملہ لغت میں بمعنی پشم گوسفند
کے ہے اور تصوف اسی سے ماخوذ ہے اور مجازاً ان کے
اعمال و افعال و معارف کو تصوّف کہتے ہیں۔

صَوف بفتحۂ صاد مہملہ لغت میں یکسو ہونے اور
روگردانی کے ہیں۔ چونکہ واصلان حق ماسوا اللہ سے
یکسوئی و روگردانی اختیار کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اعمال
و افعال و معارف کو تصوف کہتے ہیں۔

سرج السالکین حضرت محی الدین سید شاہ
عبداللطیف قادری المعروف بہ **قطب ویلور** قدس سرہٗ
اپنی گراں مایہ تصنیف **جواہر الحقائق** کے شروع میں
تصوف کی تعریف سید وجیہہ الدین گجراتی صاحب "حقیقت
محمدیہ" سے بحوالہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ
علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ:۔

التصوف هو ان يميتك الحق عنك
و يحييك به جس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی وہ ہے، جو
فانی اللہ و باقی باللہ ہو۔ تخلقوا باخلاق اللہ کو بھی
تصوف کہتے ہیں۔ شیخ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ
سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رح سے سوال کیا کہ صوفی کون
ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا صوفی وہ شخص ہے جس کے
چہرے پر حیا ہو، جسکی آنکھیں پرنم ہوں۔ اس کے قلب میں صفائی
ہو، اس کی زبان پر حمد و ثنا ہو۔ اس کے ہاتھ میں جود و عطا
ہو، اس کے وعدے میں وفا ہو۔ اس کے کلام میں شفا ہو۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔
هٰذا علمنا مشيد بالكتاب والسنة یعنی یہ
ہمارا علم تصوف کتاب و سنت کے بنیادوں پر قائم ہے۔
مجدد الف ثانی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ
علیہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت ابو القاسم رحمۃ اللہ علیہ
فرماتے ہیں کہ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ تصوف کی بنیاد کتاب
و سنت کی تصریحات پر ہے۔ لہٰذا جو شخص ان نعمتوں سے
محروم ہے، اس نے تصوف کی بو نہ سونگھی۔ بعض صوفیائے
کرام نے اپنی جد و جہد سے تصانیف لکھیں اور تصوف کو اپنے
زور قلم سے نکھارا اور اس کے مختلف گوشوں کی وضاحت
کی، ہر فن کے کچھ نہ کچھ اصطلاحات ضرور ہوتے ہیں۔
اسی طرح فن تصوف کے بھی اصطلاحات ہیں۔

آج بعض لوگ یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں ہے۔ جواباً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ فنِ تصوف کے اصطلاحات کو بغور پڑھیں اور تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو وہ یقیناً اس کی حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ایک فقیہہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی ظاہری تفصیلات بیان کر کے مطمئن ہو جاتا ہے، اور ان کے فلسفہ سے قطعاً تعرض نہیں کرتا۔ ایک متکلم صرف عقائد کی حد تک فکر و تعمق کی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتا ہے لیکن تاریخ شعائر و رسوم کی کوئی تسلی بخش توجیہہ بیان نہیں کرتا۔ ایک مورخ صرف واقعات بیان کرتا ہے مگر اُن گذشتہ حقائق کا ہماری موجودہ زندگی سے کیا تعلق ہے۔ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ اسی طرح ایک محدّث صرف احادیث و روایات کی حد تک مسئلہ کی چھان بین کرتا ہے مگر کسی مسئلہ کی گہرائی میں ڈوب کر اس کے اندر جو معنویت پائی جاتی ہے اس کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ مگر صوفی جب ان مسائل پر گفتگو کریگا تو اس کا انداز اُن تمام سے مختلف ہوگا۔ وہ نماز میں جو معنویتیں ہیں اُن کی نشان دہی کریگا۔ ایک روحانی فلسفہ کو نکھار کر نظر و بصر کے سامنے لائیگا اور بتائے گا کہ عبادات کے اس نظام کو تقرب الی اللہ کے لئے کیونکر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نیز بتائے گا کہ عبادات کو فکر و تعمق یا تاثیر پذیری کی اعلےٰ قدروں میں کیونکر بدلا جاسکتا ہے۔

(ماخوذ از تعلیمات امام غزالیؒ)

آج دنیا کے بڑے بڑے مفکرین جنہوں نے انسان کی ظاہری زندگی کو آراستہ کیا ہے اور وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ باطنی زندگی بھی اسی طرح آراستہ ہو، یہ محال ہے کیونکہ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے جبتک فنِ تصوّف کو اپنا ذریعہ نہ بنائے۔ آج فنِ تصوف کی ہزار سالہ تاریخ اُن اقوام کا آئینہ ہے جو انتہائی کوششوں سے اصلاحِ نفس کی ہے۔

تصوف کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے اس لئے ہر ایک سالک صوفی کو سب سے پہلے اخلاق کی تعلیم دیجاتی ہے تخلقوا باخلاق اللہ کے تحت ایک صوفی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کا مظہر ہوکر مخلوق کے سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرام اپنے بلند اخلاق و اعلیٰ کیرکٹر کی وجہ سے بہت جلد اپنوں اور غیروں میں، مقبول ہوگئے تھے اور اپنی تعلیمات کو آسانی دوسروں تک پہنچانے میں وہ کامیابی حاصل کی جو کسی طاقت کے بل پر برسوں میں حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ صوفیائے کرام نے ہمیشہ پریت و شانتی کے ترانے گا کر بے چین انسانیت کو امن و سکون کے گہوارے میں خواب شیریں سے ہمکنار کیا۔

" بقول کسے، اگر انسانیت نے سیاسی بدنظمی و معاشی بدحالی کا علاج جمہوریت و اشتراکیت کے ذریعہ بھی کرلیا تو جب تک وہ نفس کی شعوری و اِن لاشعوری قوتوں کو ضبط میں لانے کے لئے کوئی باطنی نظام نہ ڈھونڈے گی

اس وقت تک فرد و جماعت کی زندگی میں وہ طمانیت نہیں
پیدا ہو سکتی جس کی ہر شخص کو آج تلاش ہے"۔

اور تصوف ایک ٹھوس حقیقت ہے جس کے بغیر فقہ
کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ وہ علم ہے جس سے انسان
حقائق عالم سے واقف اور اسرار کائنات سے روشناس
ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنی عبادت میں لذت' اور اپنے اعمال میں
سکون نصیب ہوتا ہے جس کے بغیر عبادتیں خشک اور اعمال
میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ بعید نہیں کہ حقیقی لذتوں سے
ناآشنا ہو کر تحیر کی وادی میں شوریدہ حال و سرگرداں
ہو جائے۔ اسی لئے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے
ہیں کہ من تفقه ولم یتصوف، فقد تفسق'
ومن تصوف ولم یتفقه فقد تزندق' ومن
جمع بینهما فقد تحقق، یعنی جس نے علوم فقہ
سیکھی اور تصوف نہ سیکھا' وہ فاسق ہو گیا' اور جس نے
تصوف سیکھا اور فقہ نہ سیکھا تو وہ زندیق ہو گیا۔ اور جو
شخص ان دونوں کو جمع کیا پس تحقیق کے حقیقت کو پا لیا۔
اس لئے ضروری ہے کہ ہم بزرگوں کے معرکۃ الآرا تصانیف
کا مطالعہ کریں۔ اور اپنے قلب کو روحانیت و اخلاقی اقدار
سے مزین کرتے ہوئے (دست بکار دل بیار) کی طرح مادی
اشیاء سے کنارہ کش ہو جائے۔

" فقد جاء فی الحدیث ان فی جسد آدم
لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا
فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب"۔

پس تحقیق حدیث شریف میں آیا ہے کہ بے شک
انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے' جب وہ صلح پذیر ہوتا ہے'
تو تمام جسم صلح پذیر ہوتا ہے۔ مگر جب وہ فاسد ہو جاتا ہے
تو تمام جسم فاسد ہو جاتا ہے' جان لو کہ وہ قلب ہی ہے"۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ تزکیۂ نفس کرتے
ہوئے مشائخ صوفیاء کے نقش قدم پر چل کر اپنی دنیا و
آخرت کو درست کر لیں۔ تصوف کے بغیر یہ چیز حاصل کرنا
دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

خدائے تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ
وسلم کے صدقے میں اپنے اسرار و حقائق سے واقف
فرماتے ہوئے کونین کی سرخروئی سے سرفراز فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی!

سنہ ۱۹۶۸ء میں جب میں بغرض زیارت سرنگاپٹم پہنچا تو وہاں کے کھنڈرات و آثار قدیمہ کے جھروکوں سے ماضی کی تاریخ دکھا دے رہی تھی۔
اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ان آثار قدیمہ پر قلم اٹھاؤں ۔ اسی خیال کے تحت اپنے متفرق خیالات کو یکجا کر کے بزم اللطیف میں شرکت کر رہا ہوں ۔

عاقل سہرا

اپنی قسمت پہ تو اے میسور بیحد ناز کر
خاک سے اُٹھا ہے تیری ایک فخر روزگار

یوں تو دنیا میں حشرات الارض کی طرح سینکڑوں انسان آئے اور پردۂ عدم میں رُوپوش ہو گئے۔ لیکن دنیا نے انہیں لوگوں کو یاد رکھا جنہوں نے مخلوق خدا کی خاطر اپنا تن من، دھن، سب کچھ قربان کر دیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آج کا انسان باعتبار سائنس و جغرافیہ، تہذیب و تمدن بہت کچھ ترقی کیا ہے اس ترقی کے بارے میں اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو درحقیقۃ یہ ترقی و کامرانی، یہ فلاح و بہبودی انہیں حضرات کا فیض و صدقہ ہے، جن کا ہر فعل دوسروں کے آرام و سکون کی خاطر ہوا کرتا تھا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن میں سے بعض نے ایک رہنما کی حیثیت سے سوئے ہوئے قلوب کو بیدار کیا اور بے حس جسم میں حرکت پیدا کی۔ کسی نے خدمت خلق کو اپنی زندگی کا فریضہ جانا اور کسی نے اعلائے حق کی خاطر اپنی جان تک قربان کر کے دنیا والوں کو یہ سبق سکھلایا کہ صدائے حق پر شہید ہو جاؤ۔ اسی مفہوم کو کسی شاعر نے کیا ہی خوب ادا کیا ہے ؎

زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بنکر رہو
اس زمیں کی پستیوں میں آسماں بنکر رہو

قارئین کرام! شیر میسور حضرت ٹیپو سلطان رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں شہداء میں سے ہیں، جو آزادی کے لئے آخری

سانس تک میدان کارزار میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے اور اپنی بہادری وجفاکشی کا لوہا منواتے رہے۔ یہ وہ ٹیپو ہیں جن کے نام سے انگریز لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ یہ ان شیروں میں سے ہیں جنہوں نے سرزمین ہند میں جنم لیکر سب سے پہلے ہندوستانیوں کو آگاہ کیا کہ "ہندوستان ہندستانیوں کے لئے" ہے۔ یہ وہی سلطان ہیں جن کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق جمیلہ سے متاثر ہو کر حکیم الشرق شاعر ہند ڈاکٹر علامہ اقبال رح نے فرمایا "**ہند میں کسی کی سلطنت میں خلافت راشدہ کا عکس تھا تو وہ ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد تھی**"۔

پیدائش ٹیپو

نواب حیدر علیخان بہادر جب وقت مرہٹوں اور انگریزوں سے جنگ کر کے کورگ، آنبور، ویلور وغیرہ پر اپنی کامیابی کے علم گاڑ دئے اور آرکاٹ میں حضرت ٹیپو مستان ولی رح کی مزار اقدس پر حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ اے محبوب خدا! مدتوں سے میری گود خالی ہے، آپ بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ مجھے اولاد عنایت فرمائیے۔ پھر کیا تھا؟ ادھر محبوب خدا کی دعا قبول ہوئی اور ادھر شہر بنگلور سے شمال مشرق کی طرف بائیس میل کے فاصلہ پر "دیون ہلی" نامی قریہ کے ذروں کی تقدیر چمک اٹھی۔ سنہ ۱۱۶۳ھ م سنہ ۱۷۵۲ء ۲۰ ذی الحجہ بروز شنبہ نواب حیدر علیخان بہادر کی زوجۂ ثانیہ فاطمہ بیگم کے بطن مبارک سے ایک مبارک چاند سا شہزادہ پیدا ہوا۔ چنانچہ بچہ کا نام ٹیپو مستان کے نام نامی پر ابو الفتح فتح علی ٹیپو سلطان رکھا گیا۔

طفولیت سلطان

سلطان کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ آپ میں حصول علم کا جذبہ موجزن ہوا۔ عربی وفارسی کی تعلیم کے علاوہ امور جہانبانی وجہانداری کی تعلیم کے لئے بھی اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا۔ لیکن آپ عربی وفارسی کی تعلیم میں زیادہ کوشاں رہے۔ جب حیدر علی کو اطلاع پہنچی کہ سلطان امور جہانبانی کی بہ نسبت عربی وفارسی تعلیم پر زور دے رہے ہیں تو سلطان کو بلا کر حیدر علی نے فرمایا۔ جان پدر! سلطنت کے لئے قلم سے زیادہ تلوار کی ضرورت پڑتی ہے۔ باپ کے ان الفاظ کو سن کر فرماں بردار بیٹے نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود کو ایک جفاکش بہادر سپاہی کے روپ میں ظاہر کیا۔ آئے دن کی لڑائیوں میں شرکت کر کے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ واقعات عہد طفلی میں سے ایک متاثر کن اور وعدہ وفائی کو ظاہر کرنے والا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ٹیپو سرنگاپٹم کی اس زمین پر کھیل رہے تھے جہاں آج مسجد اعلیٰ واقع ہے، اچانک ایک روشن ضمیر بزرگ کا گذر آپ پر ہوا تو اس بندۂ خدا نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔ تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے اس ملک کا حکمران بنائے گی اور جب وہ وقت آئیگا تو اس جگہ ایک ایسی مسجد تعمیر کر جو زمانہ بھر میں تیری یادگار رہے۔ سلطان نے جواب دیا جب میں بادشاہ بنوں گا تو ضرور ایسا کروں گا۔ سلطان نے

اپنی تخت نشینی کے بعد اپنے وعدہ کو عملی جامہ پہنانے ہوئے دنیا پر یہ آشکارہ کردیا کہ وہ وعدہ وفائی میں یکتا و بے نظیر ہے۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

سلطان ۱۷۶۷ء میں سات ہزار کی جرار و جفاکش فوج لیکر بندرگاہ منگلور پر پہنچے اور انگریزی فوج کو دیکھتے ہی اندازہ لگالئے کہ اتنی قلیل فوج لیکر دشمن سے مقابلہ ناممکن ہے، چنانچہ حیدرعلی کی خدمت میں ایک مراسلہ ارسال کیا جس کو دیکھ کر حیدرعلی بذاتِ خود ایک لشکرِ کثیر کے ساتھ آپہنچے اور حکم دیا کہ قلعہ پر حملہ کیا جائے۔ سلطان نے کوشش و جانفشانی کے بعد قلعہ فتح کرلیا۔ بعدازیں نظام مرہٹوں اور انگریزوں کی سرکوبی کے لئے ٹیپو مدراس پر ایک شیر کی طرح لپکے۔ اور ایسی عجلت و شدت کے ساتھ وار کیا کہ مدراس میں انگریزوں کے پرچے اُڑگئے۔ حیران و پریشان ہوکر حیدرعلی کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ اسی سال کڈپہ، کرنول، بلہاری، اناگندی اور دھاڑواڑ پر چڑھائی کرکے شاندار کامیابی حاصل کی۔

جب ان لڑائیوں سے کچھ فرصت پائی تو حیدرعلی نے سوچا کہ سلطان کی شادی کردی جائے۔ حسب خواہش ۱۷۷۴ء میں سلطان کا عقد سعید امام صاحب بخشی نائطی کی دختر سے انجام پذیر ہوا۔

سلطان کی تخت نشینی

انگریزوں کے سردار کرنل بیلی اور سرائرکوٹ سے میسور کی دوسری جنگ ابھی پورے طور پر ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ملیبار کے نائروں نے بغاوت شروع کردی تھی۔ سلطان ان باغیوں کی سرکوبی و سرتابی کے لئے روانہ ہوئے آپ ابھی منگلور کے قریب ہی تھے کہ ادھر حیدرعلی خان بہادر اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ جب سلطان کو والدِ محترم کے انتقال کی خبر پہنچی تو ان کے رنج وغم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بہرکیف منگلور سے واپس ہونے کے بعد ۲۰ محرم الحرام سنہ ۱۱۹۶ھ بمطابق سنہ ۱۷۸۲ء بروز یکشنبہ سلطان نے تاج شاہی پہنا اور سلطنت حیدری کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیکر میر صادق اور پورنیا کو دیوان اور وزیر مالیات کے درجوں پر فائز کیا۔

سلطنت انتظامات

ٹیپو سلطان نے تخت نشینی کے بعد میر صادق پر حکم صادر کیا کہ مردم شماری کی جائے۔ ہر قریہ و دیہات میں عدل وانصاف کے لئے پنچایت بورڈ قائم کئے جائیں۔ جن جگہوں پر ڈاکوؤں اور قزاقوں کا خوف تھا وہاں محکمۂ پولس کا انتظام کیا گیا۔ خط و کتابت کی آمد و رفت کے لئے محکمۂ ڈاک قائم کیا۔ تاجروں کاشتکاروں کی سہولت کے لئے بیانک ورکوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کیں۔ غذائی مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے سلطان نے بنگلور اور سرنگاپٹم میں دو باغ بنائے جن میں غیرممالک سے درخت بیج منگوا کر کاشت کی جاتی اور اندازہ لگایا جاتا کہ ان کی کاشت اس ملک میں ممکن ہے یا ناممکن

چنانچہ بچانن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "میں نے لال باغ دیکھا۔ یہاں زمین کو مربع خطوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر قطعہ کے بازو راستہ ہے جس پہ دونوں جانب خوبصورت سرو کے درخت لگے ہیں۔ یہ قطعے پھل دار درختوں کی قسموں کو علیحدہ علیحدہ قطعے مخصوص کئے گئے ہیں۔ یہاں سرو، انگور، ناشپاتی اور سیب کثرت سے اور نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ بہ تعجب سے دیکھا گیا کہ ٹیپو نے جنوبی افریقہ سے صنوبر و سرو کے جو درخت منگوا کر لگوائے ہیں وہ نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ ایک زمانے میں میسور ریشم اور چائے پھل سے ناآشنا تھا سلطان نے چین و بنگالہ سے شہتوت اور چائے پھل کے درخت منگوائے جن کی کاشت ٹمکور و کنگل کے قریوں میں کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی دنوں میں میسور میں ریشم تیار ہونے لگا اور چائے پھل غیر ممالک کو بھیجا جانے لگا۔ تجارت وزراعت کے ساتھ ساتھ سلطان نے صنعت وحرفت کی جانب بھی توجہ فرمائی۔ بڑی بڑی کانیں تلاش کی گئیں۔ علاقہ کولار اور وائے ناڈ میں سونا اور لوہا نکالا جانے لگا۔ کوئی مقام مٹی کی مصنوعات میں شہرت رکھتا تھا تو کوئی لکڑی کے کام میں سبقت لے گیا تھا۔ بنگلور میں رسیاں۔ قالین، ریشم تیار ہوتا تھا تو سرا میں پھولدار چھینٹ، کمبل اور لاک تیار ہونے کی وجہ سے غیر ممالک میں تک اس کی شہرت کے چرچے تھے۔

بہر کیف سلطان کے احسانات و اکرامات اتنے ہیں کہ جن کے بارے میں میسور سر اونچا کرنے سے قاصر ہے۔

سلطان کا زہد و تقویٰ

روزانہ بعد نماز فجر سلطان قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور اپنے زہد و تقویٰ میں اس قدر کامل تھے کہ جب مسجد اعلیٰ کا افتتاح ہوا تو زمانے کے بڑے بڑے علماء و مشائخین نے متفقہ فیصلہ کیا کہ مسجد اعلیٰ میں پہلی نماز وہ شخص پڑھائے جو صاحب ترتیب ہو۔ تلاش کرنے کے باوجود کوئی صاحب ترتیب نہ ملا۔ تب سلطان نے مسکراتے ہوئے فرمایا الحمدللہ میں صاحب ترتیب ہوں، پھر مسجد اعلیٰ میں پہلی نماز کی امامت خود سلطان نے فرمائی۔

سلطان کی رحمدلی و بہادری

سلطان کی رحمدلی کے بارے میں صاحب سلطنت خداداد لکھتے ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ سلطان اپنے خیمہ میں سو رہا تھا تو اسے کراہنے کی آواز آئی۔ خیمہ سے نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ قیدی پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ سلطان نے خود جاکر انہیں پانی لاکر پلایا۔ اور اس وقت تک نہ سویا جب تک کہ قیدی نہ سو گئے۔

سلطان کی بہادری مشہور ہے۔ چنانچہ فرانسیسی افسر کے ہمراہ شیر کے شکار کو نکلے اچانک راستے میں ایک شیر دکھلائی دیا۔ فرانسیسی افسر نے بندوق سے نشانہ بنانا چاہا مگر اس شیر دل سلطان نے اس سے بندوق چھین لی اور نیام سے تلوار نکال کر ایسا وار کیا کہ پلک جھپکنے میں شیر کے چاروں پیر جسم سے الگ ہو گئے۔ یہی وجہ

ہے کہ آج بھی ہر بچہ و بوڑھا آپ کو شیر میسور کے نام سے
یاد کرتا ہے۔

ٹیپو کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری

سلطان ایک مسلم متقی بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر مسلم
مذاہب کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ آپ ملیبار کو
فتح کرتے ہوئے گروایوآر مندر کے قریب پہنچے تو وہاں
کے پجاری حیران و پریشان ہو کر مندر سے مورت کو
ٹراونکور روانہ کر دئے۔ جب ٹیپو کو اس کی اطلاع ملی
تو مورتی کو واپس منگوا کر نصب کرنے کا حکم دیا۔ اس
کے علاوہ یہ بھی حکم دیا کہ اس شہر سے جو بھی آمدنی ہو
اس مندر کے لئے وقف کر دی جائے۔ آج بھی سرنگاپٹم
جاتے ہیں تو نظریں سب سے پہلے ان دو بڑے مندر سے
ٹکراتی ہیں جو اسٹیشن کے بالکل قریب ہیں بنگلور میں بھی
قلعہ سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا مندر ابھی تک موجود ہے۔

ٹیپو کی آخری جنگ اور شہادت

اب کا سفر تو وہ ہے نہ دیکھینگے پھر وطن
یوں تو ہزار بار غریب الوطن ہوئے

لارڈ ویلزلی ہندوستان میں گورنر کی حیثیت
سے آنے کے بعد ایک سطحی جائزہ لیتے ہوئے ٹیپو کو شکست
دینے کے لئے سب سے بڑی چال اس نے یہ چلی کہ،
سلطنت خداداد میں سازشوں کا جال بچھا کر میر صادق
پورنیا اور میر غلام علی (لنگڑا) وغیرہ کو اپنے پیچھے ہیں
لے لیا۔ اور بآسانی حیدرآباد کی فوج لیکر سرنگاپٹم
پہنچ گیا۔

مورخہ ۴ مئی دس بجے کے قریب مطابق سنہ ۱۲۱۳ھ
سلطان قلعہ کی شمالی فصیل کی جانب تشریف لاکر
اس فصیل کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس جگہ سایہ دار آم
کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا طلب فرمائے۔ صرف ایک
ہی لقمہ حلق سے اترا تھا کہ یہ اطلاع ملی کہ انگریزی فوج
نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ یہ سنتا ہی تھا سلطان نے
دستر خوان چھوڑ کر اس وقت جو امراء و وزراء وہاں موجود
تھے اُن تمام پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فرمایا اس غداری
کا نتیجہ اس وقت معلوم ہوگا جب تم اور تمہاری آئندہ
نسلیں ملک میں محتاج و ذلیل ہو کر ایک ایک دانا چاول
اور پیاز کی ایک ایک گٹھی کو ترسیںگی۔ بعد ازاں تلوار
میان میں ڈال کر اپنی دونالی بندوق ہاتھوں میں
تھامے ہوئے نیم رنگ کپڑے کی قبا زیب تن کئے
ہوئے ڈڈی نامی دروازے سے نکل کر اپنے ہمنواؤں
کے ہمراہ علم بتیری کی جانب بڑھنے لگے۔ سلطان
دہلی دروازے کے قریب پہنچکر بڑھتی ہوئی فوج کو قلعہ میں
داخل ہونے سے مسلسل تین گھنٹوں تک باز رکھے لیکن
پورنیا اور میر معین الدین کی غداری کی وجہ سے جنوب کی
جانب سے انگریزی فوجوں نے گولی برسانا شروع کر دیا۔
مجبوراً سلطان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب ڈڈی نامی دروازے

پر واپس پہنچے تو اس کو مقفل پایا کیونکہ سلطان کے
نکلتے ہی نمک حرام میر صادق نے اس کو بند کروا دیا تھا تاکہ
آپ واپس نہ آسکیں۔ شہر کے بڑے دروازے پر پہنچے،
تو یہاں جنوبی مشرق سے انگریزی فوجوں نے گھیر لیا۔ آخر کار
شہر کے دروازے پر لڑائی چھڑ گئی۔ جب سلطان پر گولیاں
برسائی جانے لگیں تو ایک ہمدرد سپاہی نے درخواست
کی کہ حضور بہتر یہی ہے کہ آپ خود کو انگریزوں پر ظاہر
کردیں لیکن اس شیر میسور نے پلٹ کر غصہ کے عالم میں
جواب دیا "**گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر
کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے**"۔

ٹیپو ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمنوں پر
ٹوٹ پڑے، آپ کے ہاتھ کی تلوار بجلی کا شرارہ معلوم
ہو رہی تھی۔ اچانک گولی لگنے کی وجہ سے آپ کا گھوڑا
زخمی ہو کر گر گیا لیکن سلطان کے جسم میں جب تک خون کا
ایک ایک قطرہ تھا آزادی کی خاطر پیادہ ہو کر لڑتے رہے۔
ایک گولی آپ کے دل پر ایسی لگی کہ آپ جانبر نہ ہوسکے۔
اور جامِ شہادت نوش فرماتے ہوئے اپنی جان کو جان
آفریں کے سپرد کر دئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آخری ہچکی نے دی اللہ اکبر کی صدا
نزع کے لمحات میں بھی تو نے کی باطل سے جنگ

جنرل ہارس جب سلطان کی نعش پر آیا، تو
فرطِ خوشی سے پکار اٹھا، "آج ہندوستان ہمارا ہے"

میر صادق و پورنیا

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن
اقبالؒ

تاریخ میں مرقوم ہے کہ میر صادق پہلے سرا میں
قیام پذیر تھا۔ جب حیدر علی نے آرکاٹ فتح کیا تو سلطنتِ
حیدری میں ملازم ہو گیا۔ پھر چند ہی دنوں میں آرکاٹ
کے ناظم کی حیثیت سے مقرر ہو گیا۔

اس کی دشمنی اور غداری کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے
کہ ایک مرتبہ سلطان نے اس کو اپنے عہدے سے معزول
کردیا تھا۔ اسی وقت سے یہ میرزادہ اپنی توہین کا دیرینہ
انتقام لینا چاہتا تھا لیکن اس کا نتیجہ من حفر
بیراً لاخیہ فقد وقع فیہ کے مصداق رہا۔

پورنیا بھی حیدر علی کے زمانے میں ملازمت میں داخل ہوا اور
ٹرانسپورٹ کا افسرِ اعلیٰ بنایا گیا اس کی غداری کے متعلق
ماڈرن میسور کا مصنف صفحہ ۳۳۱ پر یوں رقمطراز ہے:

میسور کی رانی لکشمانے اس سے درخواست کی
کہ میسور میں دوبارہ ہندو راج قائم کرنے میں وہ (پورنیا)
اس کی مدد کرے تو وہ اس تجویز کا مخالف نہیں تھا۔
لیکن اس نے کھنڈے راؤ جیسی کھلی بغاوت بھی نہیں کی،
اس کی اس پالیسی کی وجہ سے انگریزوں نے اس کو
میسور کا دیوان منتخب کیا۔ اور رانی نے بھی قبول کر لیا۔

سلطان کی تدفین

سلطان شہید کی موت درحقیقت
آزادی کی موت تھی۔ غیرت

وخودداری کی موت تھی جس کی وجہ سے آسمان بھی آنسو
بہائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ۲۸ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ کو جنرل
ہارس کے حکم سے تمام شہزادوں، ندیموں وغیرہ کو سلطان
کا دیدار دکھلایا گیا۔ بوقت ظہر جنازہ نہایت ہی احترام
واحتشام کے ساتھ قلعہ سے روانہ ہوا۔ جن جن رستوں
سے سلطان کا جنازہ گذرا وہاں دردناک وغمگین
صداؤں سے صدا پُر تھی۔ گویا ایک قیامتِ صغریٰ
برپا تھی۔ حیدر علی خاں بہادرؒ کے مقبرے پہ جنازہ
رکھتے ہی آسمان پہ سیاہ گھٹائیں چھانے لگیں، اور
کچھ دیر میں دن رات کی شکل میں بدل گیا۔ بادلوں
کی مہیب گرج اور بجلی کی خوفناک کڑک نے زمین کو
ہلاکر رکھ دیا۔

دریائے کاویری اچانک جوش میں آگئی۔

یہ ایک ایسا جاں خراش منظر تھا کہ تمام کے دل دہل
گئے اور ہر شخص کو آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی
اندھیرا نظر آرہا تھا۔ اس جاں لیوا منظر میں فوج نے
آخری سلامی ٹیپو کے نذر کی۔

پھر تمام لوگ نمازِ جنازہ کے لئے صف بستہ
کھڑے ہوگئے۔ امام کی زبان سے لفظ اللہ اکبر نکلا تو
یہ معلوم ہوا کہ آسمان ٹوٹ کر زمین پہ گر رہا ہے۔

بعد نمازِ جنازہ پیکرِ جلال شیرِ میسور ٹیپو
سلطانؒ اپنے باپ نواب حیدر علی خان بہادر مرحوم و
مغفور کے پہلو میں سپردِ خاک کردئے گئے۔

جینا انہیں کا جینا، مرنا انہیں کا مرنا
ایک بانکپن سے جینا اک بانکپن سے مرنا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

از
کے یم۔ شاکر اللہ
مدن پلی (آندھرا)
متعلم زمرۂ خامسہ
دارالعلوم لطیفیہ ویلور

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبین
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

خلافت ہو یا ملوکیت، جب تک اس کرۂ ارض پہ مسلمان ایک ہی پرچم کے نیچے جمع تھے اور ان کا ایک مرکز و محور تھا اسوقت تک ان کی شہرت کے ڈنکے سارے عالم میں گونج رہے تھے، جن کے خوف و دبدبہ سے دوسری حکومتیں لرزہ براندام تھیں کسی کی مجال نہیں تھی کہ قوم مسلم کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی دیکھ سکے اور خود ان کی اپنی حکومتوں کا استحکام اسلامی حکومت کا مرہونِ منّت ہوا کرتا تھا اور اسلامی حکومت دنیا کی ایک عظیم ناقابل تسخیر قوت کہلانے لگی۔

وہ دن بڑا ہی منحوس تھا جس میں مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہوگئی اور ان کا شیرازۂ ملی بکھر گیا۔ دن بدن اُن میں کمزوری آنے لگی۔ کل کے معاون آج کے طالب اعانت بن گئے۔ آج جبکہ مسلمانوں کا کوئی ہمدرد و حامی نہیں، اس کس مپرسی کے عالم میں مسلمان مختلف حصوں اور ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ نہ تو ان کا کوئی مرکز ہے اور نہ ایک پرچم، مثلاً عرب ممالک ہی کو لیجئے کہ وہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں ذرا سا بھی جذبۂ اتحاد و اتفاق ہوتا تو وہ ضرور اپنا ایک مرکز قائم کرتے اور ساری دنیا کے مسلمان اسی ایک پرچم کے نیچے جمع ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ سہ

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

مسلمانوں کا یہ لاجواب و لازوال مذہب ایسی ٹھوس تعلیمات کا حامل ہے کہ جس کی بدولت عالم کو امن و یگانگی کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہم اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں اور عالم میں امن و سلامتی کا علَم بلند کیوں نہ کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کئی ارب آبادی میں اسلامی آبادی نوے کروڑ ہے اگر یہ مسلم تعداد متحد ہو کر اپنا ایک مرکز و محور قائم کرلے تو پھر سے ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگیں گے اور اپنے اسلاف کی طرح ہر جگہ فتح و نصرت ان کے قدم چومیگی، اور

دنیا کی ہر مخالف طاقت ان کے مقابلہ سے گریز کرے گی، ایک طرف تعلیمات اسلام کے ذریعہ امن و سلامتی کا علَم بلند ہوگا تو دوسری طرف ہمارے کھوئے ہوئے مقدس مقامات ہم کو پھر سے حاصل ہونگے۔ اس طرح اسرائیلی جارحیت ہی نہیں ہر مُسلم دشمن قوت کا قلع قمع ہو جائے گا۔

اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی اتحاد کے نظرئے کو آج سے بیس سال قبل ایشیا کے عظیم لیڈر محمد علی جناح نے پیش کیا تھا اور اسکی تائید سب سے پہلے کرنیوالے والیٔ اردن شاہ عبداللہ تھے۔ آپ نے صرف اس کی تائید ہی نہیں کی بلکہ ہر حیثیت سے اسکی مدد کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مغربی استعماری قوتوں میں کھٹکنے لگے۔ لہٰذا چند ہی دنوں بعد مسجد کی سیڑھیوں پہ آپ کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

آٹھ سال کی بات ہے کہ الجیریا کے مقبول لیڈر جناب احمد بیلوا ور تفا بیلو، یہ دونوں حضرات اسی تحریک کو لے کر اٹھے کہ دنیا میں اسلامی سکریٹیریٹ قائم کیا جائے تاکہ ممالک اسلامیہ متحد ہوکر اسلامی مرکز قائم کریں، لیکن حوادثات زمانہ نے اُن کے ساتھ بھی اپنے اصول کے مطابق بے وفائی کی اور دونوں حضرات یکے بعد دیگرے شہید کر ڈالے گئے۔

دشمنانِ اسلام کی یہ خواہش ہے کہ مسلم حکومتیں متحد نہ ہونے پائیں اور مسلمان ہمیشہ آپس میں سر بگریباں رہیں کیونکہ ان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر یہ اپنا ایک مرکز قائم کرلیں تو ہمارے عزائم میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ استعماری طاقتوں اور باطل قوتوں کی پیہم ریشہ دوانیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے باوجود آج بھی دنیا میں ایسے نڈر اور بے باک دردمند لیڈر موجود ہیں، جن کے دلوں میں قوم و ملّت کی سچّی تڑپ ہے، وہ شب و روز اس بات میں کوشاں ہیں کہ مسلمان قوم ایک پلیٹ فارم پہ آجائے اور عالم میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہو۔ اس لئے ماہِ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء میں بمقام جدہ ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مطمح نظر یہ تھا کہ وہ اسلامی سکریٹیریٹ قائم کرے، اس کے لئے والیٔ حجاز شاہ فیصل نے بڑی جاں فشانی کے ساتھ کام کیا اور تنکو عبدالرحمٰن نے بھی اس کو پروان چڑھانے کی اَن تھک کوشش کی۔

جدّہ میں یہ کانفرنس ۲۳ مارچ سے مسلسل تین دن تک قائم رہی جس کی صدارت جناب عمر سقاف نے فرمائی اور اس اسلامی سکریٹیریٹ کے سکریٹری جناب تنکو عبدالرحمٰن مقرر ہوئے۔ غرض اس جدہ کانفرنس میں دنیا کے بائیس ممالک اسلامیہ کے وزرائے خارجہ نے شرکت کی۔ سوائے دو کے تمام ممالک نے متفقہ طور پر یہ منظور کیا کہ ایک اسلامی سکریٹیریٹ قائم ہو جس کے ذریعے عالم اسلام اپنا ایک مرکز قائم کرے اور خصوصًا اسرائیلی جارحیت کا انسداد کیا جائے۔

بقول صدر کانفرنس جناب عمر سقاف کے یہ فرقہ وارانہ فسادات کو اُجاگر کرنے والا کوئی مذہبی

اجتماع نہیں ہے بلکہ اس کا منشا اخوت و بھائی چارگی کو فروغ دینا ہے اور اس سکریٹریٹ کا مقصد اصلی یہ کہ اسرائیلی جارحیت، مسجد اقصیٰ اور فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلہ کا حل ڈھونڈنا ہے۔ غرض اسی مسلم سکریٹریٹ کے بارے میں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب ممبر آف پارلیمنٹ نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ "

عزّت مآب حضرات! میں جدّہ میں ممالک اسلامیہ کی سہ روزہ کانفرنس کو جو ۲۳، ۲۴، ۲۵ ماہ مارچ ۱۹۷۰ء کو ہوئی اور جس کے فیصلہ کے تحت اسلامی سکریٹریٹ کا مکہ معظمہ میں قیام عمل میں آیا ہے ملت اسلامیہ کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتا ہوں، عالم اسلام کے خلاف اسرائیلی جارحیت سے ملت کی آبرو، جو مشرق وسطیٰ کی سرزمین پر خاک و خون میں مل گئی اس کے دوبارہ حصول کے لئے وحدت کلمہ کی بنیاد پر ملت کا عالمگیر اتحاد میں ضامن ہو سکتا ہے تاکہ اسلامی ممالک کے تمام وسائل و ذرائع مجتمع کر کے اس فرعونی چیلنج کا جذبۂ جہاد کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جدہ میں دنیا کے بائیس مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ملت اسلامیہ کے اتحاد کی طرف پہلا مثبت اقدام ہے اور یہاں اتحاد کی بنیاد مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اور یہی بنیاد پائیدار اور مستحکم ہوا کرتی ہے۔ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلام کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی ہے"۔

غرض مسلمانانِ عالم کو چاہیئے کہ اپنے اسلاف کے دَور کے ساتھ اپنے دَور کا موازنہ کریں اور پھر اپنے گریبان میں سر ڈال کر سوچیں کہ کیا ہم پھر سے وہ دَور لا سکتے ہیں (تو یقیناً دل سے ہم آواز ہو کر وہ دور ضرور لا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس ..... زرّین موقع کو غنیمت جان کر اپنا ایک مرکز قائم کرنے کی سعی کریں اور خودداربن کر ایک ہی پرچم کے نیچے کھڑے ہونے کی استطاعت اپنے اندر پیدا کریں۔ اگر ہم اس مسلم سکریٹریٹ کے ذریعہ بجائے مختلف مرکزوں کے ایک ہی مرکز کو مستحکم کر لیں تو ہو سکتا ہے کہ سارے جہان کے مسلمان اکٹھا ہو جائیں گے اور پھر سے اپنے اسلاف کی طرح وہ دَور لائیں گے، اور اسلامی حکومت قائم کر کے سارے جہاں میں شیر و شکر کی ندیاں بہا دینگے۔ ان تمام نتائج کے پیش نظر اس اسلامی سکریٹریٹ کا قیام مسلمانوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے لہٰذا اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے جدّہ کانفرنس کے اختتامی جلسہ میں صدرِ کانفرنس جناب عمر سقاف نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "عزّت مآب حضرات! اس تاریخ ساز لمحہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اس تاریخی اہمیت کے وقت اس کانفرنس نے سکریٹریٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس کا عارضی صدر مقام وہ مقدس شہر ہو گا جیسے مہبطِ وحی اور گہوارۂ رسالت محمدی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جہاں سے ان مسلمانوں کو اتحاد و تعاون کا وہ پیغام ملا تھا جس نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا تھا۔ انہیں مقاصد کے لئے ہمارا ملک

کوشش کرتا رہا ہے، اور آئندہ بھی شاہ فیصل کی
قیادت میں اسکے لئے کوشش کرتا رہے گا۔ ہم آپ سے
عہد کرتے ہیں کہ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کو نصرت و
تائید کا جو ہدف مقرر کیا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے ہم
کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ ہم خدائے واحد سے
دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری امداد کرے، ہماری مقدس
زمین ہمیں پھر مل جائے اور ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔

۵ حفاظت جس سفینے کی انہیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

یہ بھی مشیّت ایزدی ہے کہ مقدس مقامات کی بے
حرمتی کے بعد اسلامی ممالک اکٹھا ہو کر کچھ سوچنے اور
کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ عالم اسلام کا ایک مرکز قائم
ہو، جہاں مسلمان اپنی قسمتوں کا خود فیصلہ کریں، اور
اسرائیل اور مسلم دشمن طاقتوں کی جارحیت کا انسداد
کریں۔ تاریخ فخر و وقار کے ساتھ ان مخلص رہنماؤں
کو یاد کرے گی کہ جنہوں نے عالم اسلام کے اتحاد
کے پرچم کو بلند کیا اور ان کی طاقتوں کو جمع کیا۔ اگر
یہ سکریٹریٹ مستحکم ہو جائے تو یقین ہے کہ انشاء اللہ
مسلمانوں کی وہ کھوئی ہوئی عظمت و شوکت واپس
لوٹ آئیگی اور دنیا کی کوئی بھی طاقت مسلمانوں کے
آنکھ میں آنکھ ملانا تو درکنار سامنے آنے سے بھی کترائیگی،
اور اپنے استحکام کے لئے اسلامی حکومت سے دوستی
کو اپنے لئے باعثِ فخر تصوّر کرے گی۔

۵

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

فضل العلماء جناب مولوی محمد شبیراللہ اکرمی صاحب
لطیفی بھٹکلی
مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان
ویلور۔

ہر چہ داری صرف کن در راہِ او
لن تنالوا البرّ حتّیٰ تنفقوا

عقائد اسلام جو اس مذہب کی اساس و بنیاد ہیں اور خشتِ اولین کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی توحید و رسالت کی گواہی، ملائکہ قیامت، حشر نشر وغیرہ پر ایمان لانا، جن میں توحید و رسالت کی گواہی کو امتیازی شان حاصل ہے اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں، اس کے بعد عبادت بدنیہ و مالیہ کا درجہ ہے جیسا کہ فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے۔ بنی الاسلام علی خمس۔ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وصوم رمضان وحج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔

ان ارکان اسلام میں سے زکوٰۃ پر موجودہ زمانے کے نئے مسائل سے متعلق چند سطور زیب قلم کرنا چاہتا ہوں۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت، النشو و نما برکت اور مدح کے ہیں۔ قرآن و حدیث میں یہ تمام معانی مستعمل ہیں۔ مگر اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ کے معنی مال کی وہ مقررہ مقدار ہے جو ایک دولتمند صدقہ کے طور پر غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس مال کو زکوٰۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ مال کو پاک کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ صدقہ کے لئے بھی مستعمل ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا زکوٰۃ و خیرات کی تعلیم و ترغیب اسلام میں ابتداہی سے تھی۔ مکی سورتوں میں اس کا ذکر تصریحاً کیا گیا ہے اور خیرات نہ دینے والوں پر سخت وعید آئی ہے مگر مدینہ منورہ میں اس کی تاکید زیادہ ہوئی۔

صدقۂ فطر ۲ھ میں عید کے دن واجب قرار دیا گیا۔ ہجرت کے ابتدائی دور میں عام مسلمانوں پر خصوصاً مہاجرین پر فاقے گذرتے تھے، اس وجہ سے یہ حکم صادر ہوا کہ جس کے پاس ضروری اخراجات سے جو کچھ بچ جائے سب خدا کی راہ میں دیا جائے ورنہ سخت عذاب ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی: والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ بعض لوگ صدقات و خیرات تو دیتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے اور بیکار و ردّی چیزوں کو خیرات

میں دیتے تھے، اس پر ارشاد ہوا یا ایھا الذین آمنوا
انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا
لکم من الارض اس طرح مقتضائے حال کے مطابق
زکوٰۃ وصدقات کی ترغیب ملتی رہی۔ اسکے باوجود ۸ھ
تک زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم نہیں ملا۔ فتح مکہ کے بعد اسکی
فرضیت ہوئی اور اس کے مصارف بھی بیان کرادئے گئے۔
اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالک مقبوضہ میں
زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے محرم ۹ھ میں عاملوں کو مقرر
فرمایا۔ زکوٰۃ کے مصارف یہ تھے۔ انما الصدقات
للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمولفۃ
قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ
وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم
(سیرۃ النبی اول) لیکن زکوٰۃ کے اس طرح واجب قرار دئے
جانے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد
جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت
ہوئے تو ان کو کئی مخالف طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔
ان میں سے منکرین زکوٰۃ کا بھی ایک گروہ تھا۔ چونکہ یہ
لوگ اپنے کو مسلمان کہتے تھے اور صرف زکوٰۃ کے منکر تھے
اس لئے ان کے خلاف تلوار اٹھانے کے متعلق خود صحابہ
رضی اللہ عنہم میں اختلاف پڑا اور حضرت عمر جیسے متشدد
وصاحب رائے بزرگ نے حضرت ابوبکر صدیق رض سے
کہا کہ آپ ایک ایسی جماعت کے ساتھ کیسے لڑ سکتے ہیں، جو
توحید ورسالت کی قائل ہے اور صرف زکوٰۃ کی منکر ہے۔
لیکن خلیفۂ اول کا عزم صمیم ان لوگوں کی اختلاف رائے
سے تبدیل نہ ہوسکا اور آپ رض نے کھلے طور پر اعلان کردیا کہ
اللہ کی قسم اگر ایک بکری کا بچہ بھی جو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی زندگی میں آتا تھا اور اس وقت روک دیا گیا ہے تو
ضرور میں اس کے خلاف جنگ کروں گا۔ اس تشدد کا نتیجہ
یہ ہوا کہ تھوڑی تنبیہ کے بعد تمام منکرین خود زکوٰۃ لے
کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے (خلافت راشدہ)
تو اس تاریخی واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ
کی کیا اہمیت ہے؟

زکوٰۃ وصدقات کے بارے میں دو چیزوں کی خصوصیت
کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔

اول تہذیب نفس۔ وہ اس طرح پر ہے کہ نفس انسانی
میں فطرتاً بخل کی خصلت پائی جاتی ہے اور ظاہر بات ہے
کہ وہ ایک بدترین اور انسان کے لئے معاد و آخرت میں
ضرر رساں شئی ہے کیونکہ جب انسان کے دل میں کسی چیز کی
محبت جاگزیں ہوجاتی ہے تو اس کا دل سے نکلنا مشکل
ہوجاتا ہے اور وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، تو
اپنی ان محبوب چیزوں کی جدائی اس پر شاق گذرتی ہے،
اور وہ جدائی بجائے خود ایک عذاب بن جاتی ہے۔ اس
طرح اس کی دنیا اور آخرت کی زندگی رائگاں اور عبث
ہوجاتی ہے۔ اس برائی سے بچنے کے لئے حق تعالیٰ اپنے
بندوں کو اس طرح تنبیہ فرماتا ہے یوم یحمیٰ علیھا
فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم

وظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما
كنتم تكنزون۔ لیکن اسکے برخلاف جب انسان اپنے اس
عزیز مال کو محض خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتا ہے جس
پر اس کی زندگی کا انحصار ہے اور جو محنت و مشقت اور
کافی عرق ریزی سے کمایا گیا ہے تو اس وقت بخل کی پلیدی
اس کے نفس سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان
میں پختگی اور تقویت پیدا ہوتی ہے کیونکہ اپنے عزیز مال
کو خدا کی راہ میں دینا کار خیر ہے اور بخل سے پاک ہونا پھر
نیکیوں کا کمانا ایک ترقی یافتہ حالت ہے اور یہ چیز خدا سے
قربت بڑھانے اور ابدی فلاح پانے کا ایک بہترین ذریعہ
ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔ قد افلح المومنون الذین هم
فی صلوٰتهم خاشعون، والذین هم عن اللغو معرضون،
والذین هم للزکوٰۃ فاعلون۔

دوسری مصلحت کہ جس کا تعلق عموماً شہر و آبادی سے
ہے اور وہ یہ ہے کہ شہر کے اندر ہر قسم کے لوگ بستے ہیں ضعیف
کمزور حاجتمند بھی اور حوادثات زمانہ کے شکار بنے ہوئے بھی،
کیونکہ زمانہ میں حوادث و واقعات اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ
کہ صبح کو ایک قوم یا ایک خاندان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا
ہے تو شام کو دوسری قوم یا خاندان ان حوادثات کا شکار ہو
جاتا ہے۔ اگر لوگوں میں فقراء و مساکین اور ضرورتمندوں کی
حاجت روائی کا طریقہ رائج نہ ہو تو بہت سے لوگ ہلاک و
تباہ و برباد ہو جائیں اور بے شمار خدا کے بندے بھوک سے مرجائیں
یہ ایک اعلیٰ درجہ کی ہمدردی ہے جسکی تعلیم مسلمانوں کو اسطرح
دی گئی ہے۔ اگرچہ زکوٰۃ امراء پر فرض ہے۔ اگر فرض قرار نہ
دی جاتی تو بھی انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ غرباء کی
امداد کی جائے کیونکہ انسان میں ہمدردی کا ہونا اعلیٰ قسم
کا جوہر ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے ایک
انسان کی بروقت حاجت اور اس کا تعاون ہوتا ہے ہر سلیم
الفطرت پر یہ بات واضح ہے کہ یہ فعل ہمدردی کا باعث بنتا ہے
اور یہ ایک ایسی خصلت ہے کہ جس پر بہت سے اخلاق کا دارو
مدار ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار اسکی تحریص
وترغیب دلائی گئی ہے اور بخیل کے متعلق سخت وعید آئی
ہے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات میں بے شمار حکمتیں
ہیں جسکی تفصیل طوالت سے خالی نہیں۔ اس کے متعلق صرف
اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ اخلاق حمیدہ کا ایک ایسا جزء
ہے جسکے بغیر اخلاق کی تکمیل ممکن نہیں اور نیز حقیقی کامیابی
کا راز اس میں مضمر ہے چنانچہ اس کے متعلق حضور صلے اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا۔ السخی قریب من اللہ قریب من الجنة
قریب من الناس بعید من النار والبخیل بعید من
اللہ بعید من الجنة بعید من الناس قریب من النار۔
سخی اللہ سے قریب، جنت سے قریب، لوگوں سے قریب ہے اور
دوزخ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے دور، جنت سے دور، لوگوں
سے دور اور دوزخ سے قریب ہے تو اس سے بڑھکر خوش
قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ صدقہ اور خیرات حق تعالیٰ کے
غصہ کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ قال النبی الصدقة
تطفی غضب الرب۔ اس طرح صدقہ و خیرات کی عادت

اپنے اندر بے شمار فضائل و برکات رکھتی ہے سعدی علیہ الرحمہ نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

بلطف و سخاوت جہاں گیر باش
در اقلیم لطف و سخا میر باش

یہ تھے اس کے فضائل و برکات اور اس کی حکمتیں۔ اب میں اپنے اصلی مقصد کی جانب بڑھ رہا ہوں جو اس مضمون کے لکھنے کا باعث بنا وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ مالداروں پر گورنمنٹ کی جانب سے مختلف قسم کے ٹیکس عائد کر دئے گئے ہیں ایسی صورت میں کیا اپنے مال کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے؟ اسکے لئے سب سے پہلے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ زکوٰۃ ایک فرض عبادت ہے۔ قرآن شریف میں جہاں کہیں نماز کا حکم دیا گیا ہے وہاں زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے قولہ تعالےٰ واتوا الزکوٰۃ اس بنا پر کسی کو اسکی فرضیت کا انکار نہیں ہوسکتا۔ یہ مالی عبادت ہے اور جس طرح نماز روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں ان میں یہ بھی ایک رکن ہے جس پر عمل کئے بغیر کوئی شخص پوری طرح اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا۔ فرمان باری ہے یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطن لہٰذا جب بھی کوئی مسلم صاحب نصاب ہوگا تو اس وقت اس پر یقینی طور سے زکوٰۃ عائد ہوگی۔

صاحب نصاب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس اتنا مال موجود ہو کہ جس پر شرعی حیثیت سے زکوٰۃ مقرر کی گئی ہو۔ نقد روپئے، چاندی، تجارت کا مال معدنیات، خزانے اور کارخانوں میں بنے ہوئے سامان میں نصاب کی مقدار دو سو درہم ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تحقیق یہ ہے کہ دو سو درہم ہمارے ملک کے معیاری وزن کے مطابق ۳۶ تولہ ۵ ماشہ ۴ رتی ہوتی ہے۔ مگر مشہور قول ساڑھے باون تولے ۵۲½ چاندی اور بیس مثقال سونے کا وزن مولانا موصوف کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ ۵ تولہ ۲ ماشہ ۴ رتی سونے کے برابر ہے۔

زیورات پر زکوٰۃ واجب ہے۔ مگر زیورات میں، جڑے ہوئے جواہرات پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ زراعت سے حاصل شدہ مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ان چیزوں کا نصاب ۵ وسق تک پہنچنا شرط ہے۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع کے ۸۰ تولہ وزن کے سیر سے تین سیر ہوتے ہیں۔ اسطرح ۵ وسق کے نوسو تولے یا تین سو صاع، یا چھ سو مدراسی پڑی ہوتے ہیں۔

شریعت میں جن چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے وہ یہ ہیں زراعت سے جو پیداوار حاصل ہو، سونا چاندی اور نقد روپئے جو سونا چاندی کے قائم مقام ہوں یعنی سال کے آغاز سے لیکر اختتام سال تک اس کے پاس موجود ہوں، اسطرح بینکوں میں جو امانتیں رکھی گئی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ ہے، مویشی، اونٹ، گائے، بھینس، بکری اور ان کے مانند دوسرے ایسے جانور جو نسل بڑھانے کے لئے پالے گئے ہوں ان میں بھی زکوٰۃ ہے اگر وہ جانور تجارت کے لئے ہوں تو ان پر بھی تجارتی زکوٰۃ عائد ہوگی، ان کی قیمت کے کے حساب سے ۲½ فی صد زکوٰۃ لی جائے گی۔ اگر جانور زراعت

اور گاڑی میں جو تتنے اور اسکی ذاتی استعمال کے لئے ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

کھیت کی پیداوار اگر بارش سے اسکی نشو و نما ہوتی ہو تو ۱۰ فی صد اور اگر مصنوعی آبپاشی سے اسکی نشو و نما ہو تو پانچ فی صد۔ یہ ان چیزوں کی زکوٰۃ ہے کہ جن چیزوں کو ذخیرہ بنا کر رکھ سکتے ہوں اور جو چیزیں ذخیرہ بنا کر رکھی نہیں جا سکتیں جیسے ترمیوے، ساگ پات وغیرہ، ان میں زکوٰۃ نہیں ہے قال علیہ السلام لیس فی الخضروات صدقۃ۔ زرعی چیزوں میں فصل کاٹتے ہی زکوٰۃ واجب ہو گی چاہے سال میں دو تین فصل بھی کیوں نہ ہوں۔ قال تعالیٰ واتوا حقہ یوم حصادہ۔

اور جو مویشی افزائش نسل کے لئے ہوں ان کی زکوٰۃ کی شرح کتب فقہ میں درج ہے۔ جس کا ذکر تفصیل سے خالی نہیں اموال تجارت میں ۲½ فی صد ہے اور خزانہ اور دفینہ ہو تو اس میں بیس فی صد زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح کارخانہ سے کوئی چیز بنکر نکلتی ہو تو اس میں ڈھائی ۲½ فی صد زکوٰۃ ہے۔

جسوقت کوئی شخص مذکورہ مقدار کا مالک ہو گا، اسکی شرح کے مطابق زکوٰۃ اس پر واجب ہو گی۔ کیونکہ زکوٰۃ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انما تؤخذ من اغنیائھم و ترد علیٰ فقرائھم اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام پر جبکہ حکومت کی جانب سے بے حساب ٹیکس عائد کر دئے گئے ہیں کیا مسلمانوں کے لئے ان کے علاوہ زکوٰۃ دینا ضروری ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور رقم مسلمانوں سے نہیں لی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔ اس اصولی ارشاد کی موجودگی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کے سوا دوسرے محصول عائد نہیں کر سکتی جبکہ مصارفِ زکوٰۃ متعین کر دئے گئے ہیں، تو اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان مصارف کے علاوہ جو دوسرے فرائض حکومت کے ذمہ عائد ہوں ان کو بجا لانے کے لئے لامحالہ پبلک پر یہ محصول لگانا ضروری ہوتا ہے اور قرآن میں اس کی ہدایت بھی دی گئی ہے یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو لفظ عفو کے متعلق علماء کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ (Economic Surplus) کا ہم معنی ہے اور اس میں نشان دہی کر دی گئی ہے کہ عفو کا صحیح محل ٹیکس ہے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ اور ٹیکس کے مصرف میں بین فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ سے اپنے مسلم معاشرہ کی اصلاح اور ان کا مالی تعاون مقصود ہے۔ اس کے برخلاف ٹیکس کی رقم شہر کی اصلاح وتنظیم کو برقرار رکھنے کے لئے عائد کیجاتی ہے اور اس میں بہت سی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں برتی جاتی ہیں اور اس کا مشکل سے دس فی صد حصہ مقصد میں صرف ہوتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ ٹیکس سے زکوٰۃ کا

مقصد پورا نہیں ہوتا تو زکوٰۃ کی ذمہ داری سے مسلمان کیسے سبکدوش ہوسکتے ہیں اور ٹیکس کی ادائیگی سے کسی شہری کو مفر نہیں۔ اگر اسلامی حکومت بھی ہو تو رعایا کے پاس زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس کی رقم وصول کی جاتی کیونکہ شہر کی اصلاح و تنظیم کا دار و مدار اسی ٹیکس کی رقم پر ہے اور یہ رقم شہریوں کی مدد کے بغیر دوسری کوئی راہ نہیں جو اس ضرورت کو پوری کرتی ہو، لہٰذا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے ٹیکس کا ادا کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ٹیکس دے کر زکوٰۃ کی ذمہ داری سے جو کہ ایک عبادت ہے سبکدوشی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا عبادت الگ چیز ہے اور سرکاری قانون علیحدہ ہے۔ اس وجہ سے دونو پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اب ایک سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ موجودہ گرانی کی وجہ سے زکوٰۃ کی مذکورہ رقوم میں تبدیلی کیوں نہ کی جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ زمانوں کی ارزانی کے تحت جو اشیاء کوئی تاجر فروخت کرتا تھا اسی مطابق اس کو رقم حاصل ہوتی تھی، اسی طرح موجودہ زمانہ کی مہنگائی کے تحت تاجروں کو اپنی قیمت وصول ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اب سے پچاس سال پہلے سونے کی قیمت ۱۵ روپئے تھی تو اناج روپئے کا چھ سیر ملتا تھا اور اب سونے کی قیمت ۱۲۰ ہے تو چاول ۲½ سیر ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سونے کی قیمت بڑھ جائے اور غلہ سستا ہاتھ آئے۔ اس میں اس طرح کسی قسم کا بین فرق نہیں ہوتا۔ نیز یہ ایک عبادت ہے جس کا تعلق دین و مذہب سے ہے۔ اگر اس میں کوئی تبدیلی کی جائے تو اس کی زد دوسرے معاملات پر پڑے گی، اور دین کے احکام کھیل بن کر رہ جائیں گے۔ اور عبادت کا مقصد فوت ہوجائے گا۔

تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ جن ممالک میں مسلمانوں کے اختیار میں کوئی چیز نہیں رہتی اور جن کے سارے اخراجات گورنمنٹ کے ذمہ ہوں وہ لوگ زکوٰۃ کیسے ادا کریں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کی حکومت جو ماہوار رقم ان کو دیتی ہے اور جہاں وہ اپنے دوسرے فرائض مثلاً حج وغیرہ ادا کرتے ہوں اس میں اگر کوئی رقم پس انداز ہوجائے اور نصاب کو پہنچ جائے، تو ان پر زکوٰۃ عائد ہوجائے گی۔

واللہ یہدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم ۔

از
شوکت حسین شاکر
مینمیوری
متعلم زمرۂ خامسہ دار العلوم لطیفیہ
حضرت مکان ویلور

(۱) خدا کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں ــــــ (قرآن شریف)

(۲) جو لوگ یتیم کا مال ظلم سے کھاتے ہیں، وہ اپنے شکم میں آگ بھرتے ہیں اور وہ عنقریب دوزخ میں جلائے جائینگے (قرآن شریف)

(۳) دو بھوکے بھیڑئے اگر بکریوں میں چھوڑ دئے جائیں تو اس قدر فساد برپا نہیں کرتے جسقدر انسان کی دولت اور مرتبہ کی حرص اسکے دین میں رخنہ ڈالتی ہے۔ (حدیث شریف)

(۴) جس نے اپنی عقل وفہم کو کافی خیال کیا اس نے غلطی کی جس نے اپنی رائے پر غور کیا وہ گمراہ ہوا (حدیث شریف)

(۵) پاک نفس آدمی عورتوں سے بھی زیادہ شرمیلا ہوتا ہے۔ - - - - (حضرت ابوبکر صدیق رض)

(۶) جو اپنے آپ کو عالم بتائے وہ جاہل ہے اور جو خود کو جنتی ظاہر کرے وہ دوزخی ہے۔ (حضرت عمر فاروق رض)

(۷) سب سے بڑا خطا کار وہ ہے جو لوگوں کی برائیاں بیان کرتا پھرے۔ (حضرت عثمان غنی رض)

(۸) انسان تو وہ ہیں جو صاحب علم یا طالب علم ہوں۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

(۹) جو شخص وقت کو برباد کردیتا ہے، وقت اسے برباد کردیتا ہے۔ (فیر میکلین)

(۱۰) اگر روزی عقل سے حاصل کی جاتی تو دنیا کے تمام بے وقوف بھوکے مرجاتے۔ (شیخ سعدی)

(۱۱) عبادت میں اس وقت تک لطف نہیں آسکتا جب تک کہ حلال کی کمائی نہیں کھائی جاتی۔ (گرونانک)

(۱۲) کوئی علم وفن ہو اسے حاصل کرنے کے لئے شعور و محنت درکار ہے۔ (بقراط)

قبول عام
از نسیم شاہ جہانپوری
کرم تک بندگی ہوتی تو نہ جانے کہاں جاتے
حقیقت صرف ہو جاتی تو افسانے کہاں جاتے
زمانہ کیا مقدر بھی ہمارا ہم سے برہم تھا
اگر تم بھی نہ اپناتے خدا جانے کہاں جاتے
اگر نظروں سے گرتے تو بھی قبول عام ہو جاتی
تو پھر یہ مے کہاں ڈھلتی یہ پیمانے کہاں جاتے
محبت میں اگر تنہائیاں معدوم ہو جائیں
تو ہم ماضی کے افسانوں کو دہرانے کہاں جاتے
اگر مشق جفا سے باز آ جاتے جفا پرور
تو پھر اہل وفا دنیا میں پہچانے کہاں جاتے
جنہیں جینا بھی مشکل تھا جنہیں مرنا بھی مشکل تھا
ترے در کے سوا وہ تیرے دیوانے کہاں جاتے
نسیم انکی جفائے روز افزوں پر محبت میں
نہ کرتے ضبط اگر تو اشک برسانے کہاں جاتے
پیش کش عالیجناب مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری دامت برکاتہم العالی
ناظم لطیفیہ دار العلوم ویلور

بہ سلسلۂ صفحہ ۱۵۰

فارسی زبان صرف غزل گوئی اور قصیدہ خوانی کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی ذخیرہ جتنا کہ اس زبان میں ہے اس کی نظیر بمشکل ہی کہیں مل سکتی ہے۔ اور جو ادویاتی نسخے اور حکیمانہ نصائح اس زبان میں مکتوب ہیں گویا یہ آپ اپنی مثال ہے۔

زبانِ شیراز سے اس عالم وجود کو اسی طرح بہت سے احسانات اور بیکراں فیض پہنچا ہے جس پہ شیراز (فارسی) پہ زور دیں تاکہ علمی ذخائر اور دستورِ عمل کی پونجی پھر سے ہمارے ہاتھ آجائے۔ اس کے متعلق جتنا بھی کہا اور لکھا جائے بہت کم اور لبِ تشنہ ہی رہیں گے۔ خیر الکلام عاقل و دل کے مطابق اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

بہ سلسلۂ صفحہ ۱۵۴

لکھا ہے کہ ہنسی بہت ہی صحت بخش ورزش اور ایک حیات بخش عمل بھی ہے۔ دنیائے طب کا اس حقیقت پہ اتفاق ہے کہ غم و غصہ سے زیادہ اعصاب و دماغ کو کمزور اور ناکارہ بنا دینے والی کوئی چیز نہیں ہے آپ کو ہمیشہ صحت مند و خوش رکھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ انسان کی مسرت سے محرومی اور بے اطمینانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کل کی خیالی امیدوں میں آج کی مسرت کھو دیتا ہے۔

زندگی کے مشکلات و مصائب

کنویں کی سطح پہ تارے صاف صاف دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اسی طرح پہاڑی کی چوٹی پہ سے انہیں الگ الگ دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہی لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں جو کامیابی و کامرانی حاصل ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ خطرات و مشکلات کا مستقل مزاجی سے مسکراتے ہوئے مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر آپ میں خود اعتمادی ہے تو ایکبار فیصلہ کر لیجیئے کہ قرآنی قدروں کو توڑنے قرآنی قیود کو مٹانے، نئی روشنی میں نیا راستہ ڈھونڈنے، زندگی کی کامیابی و کامرانی آپ کی سواگت نہ کرےگی! وہ انسان عظیم ہے جس نے زندگی کے طوفان کا ہنستے ہوئے مقابلہ کیا اور ناکامیابی و ناکامرانی سے گھبرانے کے بجائے انہیں کامیابی کا ذریعہ بنایا۔ وہ انسان کچھ نہیں کر سکتا جس کا اپنا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔

از بسکہ مشکل ہے ہر ایک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۱۲ سـ

الحمد للہ الذی جعل لکل شیئ سببا وانزل علی عبدہ کتابا عجبا فیہ من کل شیئ حکمۃ وَّنبا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد اشرف الخلیقۃ عجما وعربا وازکاھم حسبا ونسبا وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ السادۃ النجبا - اما بعد

انسان نے جب اپنے خالق سے روز ازل میں کئے ہوئے وعدے کو فراموش کردیا اور جہالت و بربریت کے اتاہ سمندر میں غوطہ زن ہوگیا اور شیطان کی اتباع کرتے ہوئے وحدہٗ لاشریک کے ساتھ اور معبودوں کو بھی شریک کرنے لگا تو دریائے رحمت جوش میں آیا اور اپنے بندوں کو صراط مستقیم پہ گامزن کرنے کے لئے اور انہیں اپنے کئے ہوئے وعدے کی جانب ترغیب لانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو ہادی و مبلغ و ناصح کی حیثیت سے مسلسل مبعوث فرماکر انسان کی ہدایت و رہنمائی کرتا رہا اور ساتھ ہی بہت سے انبیاء کرام پہ صحیفے بھی نازل فرمایا اور ان میں اولو العزم پیغمبر جیسے خلیفۃ اللہ حضرت داؤد علیہ السلام اور کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور روح اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہ زبور، توراۃ، انجیل جیسی بڑی بڑی مقدس آسمانی کتابوں کو مختلف قوموں کی مختلف زبانوں کے ساتھ مختلف مقامات پہ نازل فرمایا اور ایک مدتِ معینہ تک ان کتب سماویہ کو اُن اقوام کے درمیان باقی اور قائم رکھا اور اس کے بعد وہ تمام منسوخ ہو چکیں لیکن قادرِ مطلق نے اپنا کلام یعنی قرآن مجید جیسی فصاحت و بلاغت والی مقدس و منور کتاب کو صرف ایک ہی قوم کے لئے خاص نہیں کیا بلکہ ساری بنی نوع انسان کے لئے رشد و ہدایت کا کامل و مکمل مجسمہ بناکر بذریعۂ وحی خاتم النبیین سید المرسلین شفیع المذنبین رحمت للعالمین صلے اللہ علیہ

وسلم پر تمام مہینوں میں مبارک مہینہ ماہِ صیام کی شب قدر میں نازل فرمایا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (سورۂ قدر رکوع ۱) — بے شک ہم نے نازل کیا اس قرآن کو شب قدر میں۔

اور

انا انزلنٰہ فی لیلۃ مبارکۃ (الدخان ع) — بے شک ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے :-

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدیٰ والفرقان (البقرہ رکوع ۲۲) — رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور راہ پانے اور حق و باطل جدا کرنے کے لئے روشن دلائل ہیں۔

جس کی ابتدا اُمّ القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کے اندر غارِ حرا میں آیتِ اقرأ باسم سے ہوئی اور اس کے لئے پسندیدہ اور فضیلت و برتری والی زبانِ عربی کو منتخب کیا گیا اور خود خدائے پاک نے قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل ہونے کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔

انا انزلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون (سورۂ یوسف رکوع ۱) — بے شک ہم نے قرآن کو عربی میں اتارا تاکہ تم سمجھ سکو۔

اور قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے پر بھی خود قرآن ناطق ہے۔

وما ینطق عن الھویٰ — آپ اپنی نفسانی خواہشات

ان ھو الا وحی یوحیٰ (سورہ نجم ع) — سے کچھ نہیں کہتے آپ کا ارشاد خالص وحی ہے

خلاق عالم کی یہ مقدس اور آخری نازل شدہ کتاب اسلام کی صداقت و حقانیت کی دائمی نشانی ہے اور یہ خاتم نبوت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کی واضح دلیل اور معجزۂ عظیم ہے جس کے نزول کی تکمیل کل تئیس ۲۳ سال کی مدت تک بغرض ضرورت تدریجی طور پر ہوئی جیسا کہ قول باری تعالیٰ :-

وقرآنا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث (بنی اسرائیل) — قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کر کے ہم نے اتارا (یہ اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں پر وقفہ کے ساتھ تم اس کتاب کو پڑھو۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے۔

لنثبت بہ فوادک — تاکہ ہم اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کریں۔

لوح محفوظ میں کلام اللہ کا کتابی شکل میں موجود ہونا

اس مقدس کلام کی تدوین اور ایک کتابی شکل میں موجود ہونے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کلام پاک ایک کتابی شکل میں اولاً خدا کے ہاں ساتویں آسمان میں لوح محفوظ میں بحفاظت تمام موجود ہے۔ چنانچہ قرآن خود شاہد ہے :-

بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ — بلکہ وہ قرآن بزرگی والا ہے لوح محفوظ میں۔

ذالك الكتاب لا ریب فیہ | اس کتاب میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

والطور وکتاب مسطور فی رق منشور | قسم ہے (کوہ) طور کی اور نوشتہ کتاب کی جو کشادہ رَق پر لکھی گئی ہے۔

عہد رسالت میں وحی الٰہی کی کتابت و ترتیب

جب بھی حضرت جبرئیل امینؑ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور آیات سناتے تو اسی وقت کسی کے ذریعہ لکھوا دیتے جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ قالت کان جبرائیل علیہ السلام یملی علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے راقم کی حیثیت سے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم بیالیس آدمیوں کو مقرر فرمایا تھا اور احادیث کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحی متلو کو حضورؐ نے رقاع (یعنی جانوروں کے چمڑے) اور کُتف (جانوروں کے بازوؤں اور پسلیوں کے ہڈیوں) اور لخاف (پتھر کی تختیوں) اور عسیب (کھجور کے پتوں) پہ لکھواتے تھے چنانچہ مستدرک حاکم میں بھی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو بطور ناظرہ پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے بریں بنا صحابہؓ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قرآنی آیات لکھوا کر اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اور اکثر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

اگرچہ کہ نزول قرآن بغیر کسی ترتیب کے وقتاً فوقتاً ہوتا رہا لیکن اس کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حین حیات ہی میں لوح محفوظ کے قرآن کی ترتیب کے مطابق ترتیب دی ہے جیسا کہ مختصر کنز میں ارشاد نبوی ہے کہ فکان اذا انزل علیہ شیئ دعا بعض من کان یکتب فیتولوا ضعوا هذا فی سورة التی یذکر فیها کذا وکذا اور لکھے ہوئے آیات کی تصحیح بھی خود فرماتے تھے چنانچہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ فان کان فیہ سقط اقامہ مذکورۂ بالا احادیث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حین حیات میں قرآن کو لکھوایا اور ان کو ترتیب بھی دی تھی، مگر ان مکتوبہ و مرتب شدہ چیز کو یکجا جمع نہ فرمایا تھا جیسا کہ کتاب یکتائی میں اسی کے تحت ایک حدیث منقول ہے قد کان القرآن کلہ مکتوبا فی عهده صلے اللہ علیہ وسلم لاکن غیر مجموع فی موضع واحد۔"

خلیفۂ اوّل کا عظیم اور درخشاں کارنامہ

بہر حال کلام اللہ کو ایک کتابی شکل میں مدوّن

کرنے کی مقدس خدمت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات
کے ایک سال بعد خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے
عہد خلافت میں انجام دی اور جمع القرآن کی وجہ یہ
بتائی جاتی ہے کہ اولاً قرآن کوئی ایک کتابی شکل میں
موجود نہ تھا بلکہ اس کے مختلف اجزاء مختلف مواضع اور
مختلف اشخاص کے پاس منتشر تھے۔ اگر کسی کے پاس
مدوّن تھا بھی تو صرف قلیل التعداد صحابۂ کرام رضی اللہ
عنہم کے سینوں میں جمع تھا جن کو قراء کے لقب سے یاد
کیا جاتا ہے لیکن عہد صدیقیؓ میں جنگ یمامہ پیش آئی
تو اس جنگ میں بہت سے قراء نے جام شہادت نوش فرمایا
جیسا کہ ان کی تعداد کے متعلق حاشیہ بخاری میں ہے
کہ کان عدۃ من قتل من القراء سبع مائۃ
یہ حادثہ جوں ہی پیش آیا تو فاروق اعظمؓ کو یہ خدشہ
لاحق ہوا کہ اگر ایسے ہی حفاظ کی تعداد جام شہادت
نوش فرماتی رہے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ قرآن
ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ خیال جوں ہی آپ کے قلب
مبارک میں آیا آپ فوراً دربار صدیقی میں آئے اور کہنے
لگے کہ مجھے قراء کی کثیر التعداد شہید ہو جانے سے یہ خوف
ہوتا ہے کہ کہیں قراء کی رحلت سے قرآن ضائع نہ ہو جائے۔
اس لئے جہاں تک ہو سکے آپ قرآن کو ایک کتابی شکل
میں مدوّن کر دیں۔ لیکن صدیق اکبر نے یہ عذر پیش کیا
کیف نفعل شیئاً لما فعلہ رسول اللہ صلے
اللہ علیہ وسلم فی حیاتہ یعنی ہم کیونکر اس کام
کو کریں جس کو سرور عالم صلعم نے اپنی عین حیات میں نہیں
کیا تھا مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پیہم اصرار
پر آپؓ نے اپنی توجہ کو اس کی جانب مبذول فرماتے
ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر کاتب وحی حضرت
زید بن ثابتؓ کو اس مقدس خدمت کے لئے منتخب فرمایا
اور ان کو حکم دیا کہ متفرق اجزائے قرآنی کو ایک مصحف کی
شکل میں مدوّن کریں۔ مگر آپ نے اس بارِ گراں امر کے
تحمل سے تامل فرمایا اور کہا کہ فواللہ لو کلفونی نقل
جبل من الجبال ما کان اثقل علیّ مما امرنی بہ
من جمع القرآن قسم ہے خدا کی اگر لوگ مجھے مکلف
بناتے پہاڑ ہٹانے پر تو یہ زیادہ گراں نہ ہوتا مجھ پر
اس چیز سے جس کا مجھ کو حکم دیا ہے یعنی قرآن کے جمع
کرنے کا۔ لیکن بعد میں آپ پر بھی اس کی حقیقت و مصلحت
واضح ہو جاتی ہے اور جد و جہد و جانفشانی کے ساتھ
اس متبرک امر کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں اور جو آیات
حیات نبوی میں رقاع عسیب اور لخاف وغیرہ پر
لکھوائے گئے تھے ان تمام کو متفرق مقامات سے حاصل
کر لئے اور مزید بر ایک آیت کے متعلق دو دو حافظوں
سے اس کی تصحیح کر لوا لیتے ہیں۔ لیکن دو سورتوں کے
چند آیات جو عہد رسالت میں عسیب و لخاف پر تحریر کی
ہوئی تھیں وہ نہ مل سکیں، ایک تو سورۂ احزاب کی
آیت جس کے متعلق آپؓ خود فرماتے ہیں کہ اس آیت کو
میں نے بذات خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک

سے سنا ہے' اور خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس
رقاع پہ لکھے ہوئے حاصل کیا جیسا کہ خود فرماتے ہیں'
قال فقدت ایتہ من الاحزاب حین نسخنا
المصحف قد کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم یقرء بھا فالتمسناھا فوجدناھا
مع خزیمۃ بن ثابت الانصاری' من المومنین
رجال صدقوا ما عاھد اللہ علیہ فالحقنا
ھا فی سورتھا فی المصحف اور دوسری سورہ
برات کی آخر دو آیتیں اگرچہ حفاظ سے ثابت ہو چکی
تھیں' اس کے باوجود حضرت ابی خزیمۃ الانصاری
(جن کی شہادت کو حضورؐ نے دو آدمیوں کی شہادت کے
برابر کا درجہ دیا تھا) کے پاس لکھا ہوا پایا جیسا کہ
بخاری شریف میں ہے حتی وجدت آخر سورۃ
التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم
اجدھا مع احد غیرہ' لقد جاءکم
رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم
حتی خاتمۃ برأت' غرض آپ نے مسلسل جدو
جہد اور انتہائی محنت و مشقت سے مکمل آیات قرآنی
کو یکجا جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرما کر خلیفہ اول کے
دربار میں پیش فرما دیا۔ حاصل کلام یہ مدون نسخہ ۱۳ھ
تک حضرت صدیق اکبرؓ کے زیر نگران رہا اور پھر خلیفہ
اول کی وفات کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ
نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور پھر آپ کے عہد
مبارک کے بعد ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے
پاس روانہ کر دیا گیا۔

جامع القرآن کے عہد خلافت میں اشاعت قرآن

اگرچہ قرآن حکیم کو ایک مصحف پہ جمع کرنے اور ایک کتابی شکل
میں مدون کرنے کی خدمت عہد صدیقی میں اس کی
تکمیل ہو چکی تھی لیکن اس کی اشاعت نہ ہوئی تھی۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل عرب اگرچہ تلاوت میں مختلف
طریقوں سے تلفظ ادا کرتے تھے لیکن معانی و مفہوم
کے اندر کوئی اثر نہ پڑتا تھا اور اس کو صحابۂ کرام
کوئی غلطی تصور نہ کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت حذیفہ
بن یمان نے ایک جنگ میں اہل عجم کے نو مسلموں کو
(جن کی مادری زبان عربی نہ تھی) مصحف کی تلاوت میں
بے شمار غلطیوں میں مبتلا پایا جس سے کلام اللہ کے
معانی و مفہوم میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی تھی۔ لہذا آپ
نے تلاوت قرآن پاک میں اختلاف واقع ہو جانے
کے خوف سے فوراً کاشانۂ عثمانی میں حاضر ہو کر
درخواست پیش کی کہ اے امیر المومنین اگر آپ اس کی
جانب توجہ نہ فرمائیں گے اور اس کی روک تھام نہ
کریں گے تو ممکن ہے کہ مسلمان بھی سابق اہل کتاب کی
طرح قرآن میں بھی اختلاف و انتشار پیدا کریں گے'
تو حضرت عثمان غنیؓ نے آپ کی اس رائے طیبہ کو پسند
فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اری ان نجمع الناس

علیٰ مصحف واحد مناسب سمجھا ہوں نہیں کہ جمع کردوں
لوگوں کو ایک مصحف پر،

اس کے بعد اس اہم کارخیر کے لئے اقدام فرمایا
اور عہد صدیقی ؓ کا مدوّن مصحف جو ام المومنین حضرت
حفصہ ؓ کے پاس تھا اس کو آپ ؓ نے منگوایا اور حضرت
زید بن ثابت ؓ اور عبداللہ ابن زبیر ؓ اور سعید بن عاص
اور عبدالرحمٰن بن حارث ابن ہشام سے اسکی نقلیں اتروائیں
اور آپ نے ان حضرات سے ساسبات کی بھی تاکید فرمادی
کہ اگر کسی آیت کے حروف میں اختلافات پیش آئیں، یا
یقینی طور پر حروف تہجی وغیرہ میں اطمینان نہ ہو، تو
لغتِ قریش کا ضرور خیال رکھیں اس لئے کہ قرآن
لسانِ اہل قریش ہی میں نازل ہوا ہے۔ غرض نقل
شدہ نسخوں کو ممالک اسلامیہ کے مختلف گوشوں میں
مثلاً مکۂ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، اور دمشق، شام وغیرہ
مقامات کی جانب روانہ فرماکر خود اپنے پاس ایک نسخہ
رکھ لیا اور جس نسخہ کو ام المومنین حضرت حفصہ ؓ کے
پاس سے طلب کئے تھے واپس لوٹا دیا اور باقی ماندہ
نقل شدہ نقلی نسخے جو عوام کے پاس موجود تھے ان کو جلا
دینے کا حکم دے دیا۔

مصحف میں نقطے اور اعراب کی ایجاد

یہ مدوّن نسخہ جو
خطِ کوفی سے مزیّن
تھا اس کو حضرت
ابوالاسود دوئلی (جو شیرِ خدا کے شاگردوں میں سے تھے)
نے مصحف کے حروف کو نقطوں سے مزیّن کیا۔ چونکہ وہ
غیر نقطہ دار تھا اور حروف میں فرق وامتیاز پیدا کرنا مشکل
و دشوار تھا لیکن لوگ نقطوں کو ایجاد کرنے کے بعد
بھی اعراب میں غلطیاں کررہے تھے تو خلیفۂ بنی امیہ
عبدالملک کے دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی
نے صحتِ عبارت کے پیشِ نظر اعراب کی علامات ایجاد
کیں۔ نیز مدوّن نسخہ جو عہدِ رسالت سے لیکر عہدِ بنی امیہ
تک رَق (پتلا چمڑہ) وغیرہ میں لکھا ہوا تھا اس کو عہدِ عباسیہ
میں جبکہ کاغذ رائج ہوچکا تھا خلیفہ مامون رشید نے
حکم نافذ کردیا کہ قرآنِ حکیم کو کاغذ پر لکھا جائے۔
غرض جو قرآن مجید آج ہمارے سامنے موجود ہے اور جسکو
ہم بآسانی تلاوت کررہے ہیں یہ انہیں بزرگ ہستیوں کی
کوشش وجدوجہد کا نتیجہ اور ان کی محنتوں کا ثمرہ
ہے اللھم اجعل القراٰن لنا اعظم ذخیرۃ
ووقنا بہ کل صغیرۃ وکبیرۃ واجعل بہ
یوم لقائك قریرۃ برحمتك فانت المستغاث
وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ
آلہ واصحابہ الطیبین الطاهرین وعلینا
معهم اجمعین الیٰ یوم الدین برحمتك یا
ارحم الراحمین والحمد للہ رب العالمین۔

عشق و محبت کا ایک ایسا رشتہ اور تعلق ہے کہ جس کے بندھن نہایت مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ یہ محض انسانی فطرت ہی کا تقاضا نہیں بلکہ یہ چیز ہر جاندار میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً چکور کو چاند سے۔ بلبل کو گل سے اور پروانہ کو شمع سے والہانہ محبت ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ چکور چاند پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے اور پروانہ شمع پر اپنی جان نثار کر دیتا ہے۔ اسی قسم کی محبت صحابۂ کرام کو رحمت عالم سرور کائنات ختم المرسلین احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی، خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔

آپ تقریباً حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے اور طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے بچپن ہی سے دونوں میں گہرے تعلقات و روابط پیدا ہو گئے تھے۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے اخلاق و سیرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت سب سے پہلی مرتبہ اسلام کی دعوت دی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بغیر کسی شک و شبہ کے آپ کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔

تبلیغ اسلام میں بھی آپ نے حضور سرورؐ عالم کا نہایت جانفشانی سے ساتھ دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔

جنگ تبوک کے موقعہ پر آنحضورؐ نے صحابۂ کرام کے سامنے ارشاد فرمایا کہ جنگ کے لئے مال و متاع کی ضرورت ہے لہٰذا تم میں سے ہر ایک شخص اپنی اپنی حیثیت کے مطابق راہ خدا میں دے۔ اس ارشاد گرامی کو سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دل میں کہا کہ اس مرتبہ میں تمام پر فوقیت لے جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اپنے گھر سے بہت سا مال لئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپؐ نے فرمایا اے عمرؓ بال بچوں کے لئے تم نے کیا چھوڑا ہے تو آپ نے عرض کیا کہ نصف مال چھوڑ آیا ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا مال پیش کیا۔ تو آپ نے ان سے بھی یہی سوال کیا کہ ابوبکرؓ تم اپنے بال بچوں کیلئے کیا رکھ آئے ہو؟ تو آپ نے فرمایا ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ اسی مفہوم کو علامہ اقبالؒ نے بھی نہایت عمدہ پیرایہ

میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو:- ؎

پروانہ کو چراغ ہے' بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں کہا کہ میں ابو بکرؓ سے کبھی سبقت نہیں لے جاسکتا، آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت عثمان ابن عفانؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ حضرت سعید بن ابی وقاصؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ جیسے اکابر صحابہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ہجرت کے بعد آپ ہی نے سب سے پہلے مسجد کے لئے جگہ خرید کردی۔ اور اس کی تعمیر میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح اہم معاملات میں شریک ہو کر بیش بہا خدمات انجام دئے۔ آپ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مصیبت میں ہمہ تن شریک رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ ظہور اسلام کے چار سال بعد مشرکین مکہ کے سامنے کلمۂ حق کا اعلان کر دیا۔ شرک وجہل کی علانیہ طور پر مذمت کرنے لگے تو اس سے مشرکین مکہ بھڑک اٹھے۔ کوئی ایذا و تکلیف ایسی نہ تھی جو اللہ کے حبیب کو نہ پہونچائی گئی ہو۔ ان مصائب کے برداشت کرنے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی برابر کے شریک تھے۔

ایک روز حرم کعبہ میں مشرکین مکہ جمع ہو کر نبیؐ برحق کے خلاف گفتگو میں مشغول تھے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم طواف کعبہ کے لئے حرم میں داخل ہوئے تو آپ کو دیکھتے ہی ان کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ تمام مجمع آپ پر ٹوٹ پڑا اور اس قدر مارا کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ کسی نے حضرت ابو بکرؓ کو خبر کردی اور کہا اپنے رفیق کی خبر لو۔ آپ دوڑتے ہوئے مجمع میں گھس گئے۔ آپ کا حضورؐ کو بچانے کے لئے داخل ہونا مشرکین کو ناگوار گذرا اور سب کے سب ان پر جھپٹ پڑے اور آپ کو بھی اتنا مارا کہ سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد جب دونوں اپنے اپنے گھر چلے آئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ سر پر جس جگہ ہاتھ لگتا تھا وہیں سے بال الگ ہو جاتے تھے۔

ایسے بہت سے واقعات تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں، جو حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری اور اطاعت و فرماں برداری پر دلالت کرتے ہیں۔

آپ ایک رفیق صدیق تھے جس کا ثبوت غار ثور کے واقعہ سے ملتا ہے۔ ہجرت رسولؐ میں آپ کو ہمراہی کا شرف حاصل ہوا اور یہ واقعہ اس قدر شہرت رکھتا ہے کہ لوگ بطور تمثیل استعمال کیا کرتے ہیں۔ اسی واقعہ کے پیش نظر آپ کو یارِ غار بھی کہا جاتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ دلی محبت تھی۔ کسی حال میں بھی اپنے رفیق کو نہیں

چھوڑا، ہر بڑے چھوٹے کام میں شریک کرتے اور دونو ایک دوسرے کے مال کو اپنا مال سمجھ کر خرچ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا مجھ پر جس کا بھی احسان تھا اس کا بدلہ ادا کردیا لیکن ابوبکرؓ کا احسان میرے ذمہ باقی ہے۔ اس کا بدلہ قیامت کے دن ان کو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد آپ ہی خلیفہ منتخب ہوئے اور امورِ خلافت کو عمدگی سے انجام دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا آپ کو انتہائی رنج تھا۔ چنانچہ حضرت سید عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب بالقاب الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ آپ کو حضورؐ سے اس طرح محبت تھی کہ حضورؐ کے فراق سے صدیق اکبرؓ کا دل جل جل کر کباب بن چکا تھا۔ اسی صدمہ سے سخت بیمار ہو گئے۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضورؐ تشریف لائے اور آپ کو سلام اور مصافحہ کیا اور فرمایا اے ابوبکرؓ کیا ابھی ملنے کا وقت قریب نہیں آیا۔ یہ سن کر آپ رو پڑے۔ پھر آپ نے (حضورؐ) فرمایا گھبراؤ مت تمہاری اور ہماری ملاقات کا وقت قریب آچکا ہے۔ یہ سن کر آپ بہت خوش ہو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو گھر والوں کو وصیت کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ میرا جنازہ تیار کرنے کے بعد مجھ کو لے جا کر حضورؐ کے حجرۂ شریف کے سامنے رکھ دینا۔ اگر حجرۂ شریف کا دروازہ کھل گیا تو مجھے اندر دفن کرنا، ورنہ نہیں۔

چنانچہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو دوشنبہ کا دن گذرنے پر مغرب وعشا کے درمیان انتقال فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا اور کفن پہنایا اور حضرت عمر فاروقؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور حسب وصیت آپ کے جنازہ کو حجرۂ شریف کے سامنے رکھ دیا گیا اور عرض کئے کہ حضرت ابوبکرؓ کا جنازہ حاضر ہے۔ یہ کہنا ہی تھا کہ خود بخود دروازہ کھل گیا۔

چنانچہ آپ کو حضورؐ کے شانۂ مبارک کے برابر دفن کیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

از مولوی کے پیس محمد صبغۃ اللہ لطیفی
کینجی ورم
متعلم دارالعلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور
قدس اسرہ العزیز

بمصطفےٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر قسم کی تعلیم موجود ہے جس کی وساطت سے انسان ہر شئی کی حقیقت کو بآسانی پہچان سکتا ہے اور نیکی و بدی میں تمیز کرسکتا ہے۔ چونکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات قرآن و حدیث ہی کی تعلیمات ہیں جیسا کہ حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنت رسولہ، قرآن کے بعد احادیثِ نبویہ ہی کا درجہ ہے۔ قرآن و حدیث، دونوں شرعی حجت رکھتے ہیں اور دونوں منجانب اللہ و منزل من اللہ ہیں۔ دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن مجید وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ چونکہ حضور صلعم جو بھی بات کہتے تھے وہ منجانب اللہ کہتے تھے اپنی جانب سے کوئی بات نہیں کہتے تھے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ احادیث نبویہ کلام ربّ علی کی تفسیر ہیں۔ حدیث انہیں ارشاداتِ گرامی کا نام ہے جو قرآن کی مزید وضاحت کیلئے آپ صلعم نے اپنی زبان اطہر سے ادا کیا تھا۔ بطور تمثیل قرآن کی اس آیت کو لیجئے:

اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ

اس آیت کریمہ میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، مگر اس میں اس بات کی تشریح و توضیح نہیں ملتی کہ وہ کس طرح ادا کئے جائیں۔ مذکورہ آیت میں اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن حکیم کو کما حقہٗ سمجھنا چاہیں تو بغیر احادیث نبویہ کے سمجھنا بہت ہی دشوار و ناممکن ہے۔ احادیث نبویہ کے ذریعے ہی تمامی آیات قرآنی کی تشریح و تفسیر کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن و حدیث ایک

دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کسی طرح بھی ان کا ایک
دوسرے سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ غرض اس کی تاریخ
تدوین کا جائزہ لیں۔

یوں تو اہل عرب کو تدوین و ترتیب کا خاصا ذوق
تھا لیکن اس کا رواج عام نہ تھا محض مستقبل کی ضروریات
نے تدوین کے لئے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین
کو آمادہ کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ
وسلم نے کتابتِ علم حدیث کی علی الاعلان اجازت عطا فرمادی تھی
عام طور پر آنحضرتؐ کا یہ معمول تھا کہ جس وقت اہم چیزیں
ارشاد فرماتے تو اس وقت صحابۂ کرام کو حکم فرماتے کہ تم
ان باتوں کو اُن لوگوں کو بھی سنادو جو اس وقت حاضر
نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض وہ لوگ جن تک میرا پیغام پہنچایا جائے
ہوسکتا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے بھی زیادہ محافظ ہوں
جنہوں نے مجھ سے سُنا ہے۔ نیز آپؐ نے حجۃ الوداع
کے موقعہ پر دورانِ خطبہ انہیں الفاظ کو دہرایا۔ آپؐ کی
زبان نہایت شیریں ہوتی تھی۔ ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر
کر کہتے اور جس بات پر زور دینا ہوتا اس کا اعادہ فرمالیا
کرتے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص اپنا واقعہ یوں
بیان کرتے ہیں کہ میں یادداشت کے طور پر نبی کریم صلے اللہ
علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا پھر مجھے ایک قریشی
نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی
خوشی کے عالم میں اور کبھی غضب کے عالم میں رہتے ہیں۔
بریں بنا میں نے ایک مرتبہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی
خدمت اقدس میں عرض کیا تو آپؐ نے جواباً فرمایا کہ تم
لکھو بخدا جس کے قبضے میں میری جان ہے میرے منہ سے
سوائے حق کے کوئی بات نہیں نکلتی۔ اور حضرت ابوہریرہ
رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ فتح مکہ کے دن
خطبہ کے لئے رونق افروز ہوئے تو ایک شخص (ابوشاہ یمنی) نے
کھڑے ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ میرے لئے کچھ
لکھوادیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اکتبوا لابی شاہ
(مفتاح الجنۃ) ان روایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ
حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں بعض
صحابۂ کرام یادداشت کے طور پر حدیثوں کو لکھ لیا کرتے
تھے۔ چونکہ حضور سرور کائناتؐ نے صحابۂ کرام کو احادیث
کے لکھ لینے کا حکم دیا تھا۔ غرض اسی طرح صحابۂ کرام نے
جو کچھ حضورؐ سے سنا اس کو محفوظ کرلیا اور بغیر کسی
کمی و بیشی کے دوسری نسلوں تک پہنچایا۔ لیکن عہدِ
خلافت راشدہ میں کثرتِ روایات سے منع فرمایا گیا۔
اس لئے کہ روایت کے وقت اس میں سے کوئی بھی جھوٹی
بات نکلنے نہ پائے۔ اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے
حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حدیثوں کو
لوگوں کے سامنے روایت کرنے سے منع فرمادیا تھا۔
اگر کوئی کرتے تو روایت کرنے والے سے دو گواہ طلب
کئے جاتے تھے۔ وہ شواھد اس طرح کے ہوں کہ دونوں
حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوں۔ اگر گواہ نہ پیش
کرتے تو ان کی روایت قبول نہ کی جاتی تھی۔ اور تنبیہ کر

دی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کثرت سے روایت کرنے کی بنا پر بعض صحابۂ کرام کو تین ماہ تک قید میں رکھا اور صحابۂ کرام سے آپ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا جائے تو تم ان کو کہدو کہ تمہارے اور ہمارے درمیان کتاب اللہ یعنی قرآن مجید ہے۔ پس اس میں حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال جانو اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام جانو اور اگر تم اس کو قرآن حکیم میں نہیں پاتے ہو تو حدیث کی طرف رجوع کرو اور اس میں جو احکام کہ بتائے ہیں اسی طرح فیصلہ کرو۔

پہلی صدی کے اواخر میں صحابۂ کرامؓ جن کے ذہنوں میں احادیث محفوظ تھیں یکے بعد دیگرے اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے لگے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات براہِ راست سماعت کی بجائے صحابہؓ سے روایت کے ذریعہ مسلمانوں تک پہنچنے لگے اور عمل بالحدیث کا وہ اہتمام کم ہونے لگا جو عہدِ صحابہؓ میں تھا۔ ایسی حالت میں خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ۱۰۱ھ میں اپنے عہدِ خلافت میں حدیث کے ناپید ہو جانے کے خطرے کو شدت سے محسوس کیا نیز جس اہتمام کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد خلیفۂ اول و ثانی حضرت ابوبکر و عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے قرآن مجید کو جمع کیا تھا اور اس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتابی شکل میں مرتب کیا تھا اسی اہتمام کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی مرکز اسلامیہ کے بڑے بڑے محدثین و حفاظ حدیث کو جمع حدیث کے لئے فرامین لکھے اور بالخصوص قاضی ابوبکر ابن حزم (گورنر مدینہ، جو ایک بڑے عالم تھے) کو حدیث کی طرف توجہ دلائی اور لکھا "آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تلاش کر کے تحریری شکل میں لے آؤ کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں علم ختم نہ ہو جائے اور علمائے کرام جہانِ فانی سے رخصت ہو جائیں اور بس صرف حدیث نبی ہی قبول کی جائے۔

انظروا ما کان من حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا یقبل الا حدیث النبی صلے اللہ علیہ وسلم (بخاری)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ حکم تنہا گورنر مدینہ ہی کے نام نہ تھا بلکہ تمام صوبہ جات کے گورنروں کو اس قسم کا منشور روانہ کیا گیا تھا۔ (فتح الباری)

ان تاریخی گواہیوں کے مدنظر تدوین حدیث کے کام کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام ابن شہاب زہری کو بالخصوص مامور فرمایا۔ چنانچہ احادیث کی ضخامتیں خاص طور پر مجلد ہو گئیں۔

غرض کلام اللہ کی طرح احادیث رسول کو بھی کتابی شکل میں مدون کیا گیا۔ محدثین کرام اور حفاظ حدیث کی کوششوں سے دوسری صدی ہجری میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور احادیث رسول کا تمام ذخیرہ کتابی شکل میں تیار ہو گیا۔

ناظرین! جس طرح عہد رسالت میں قرآن مجید کا کتابی

شکل میں غیر منضبط ہو کر عہد صحابہ میں اس کا مرتب ہونا
مخالفین کے علاوہ سب ہی سلیم العقل حضرات نے اس کو قبول
فرمالیا اسی طرح عہدِ صحابہ میں احادیث کی تدوین نہ ہو کر عہدِ
تابعین کے اواخر میں اُن احادیث کا کتابی شکل میں مدون
ہونا صحیح العقل و سلیم الفطرت انسان کے لئے کسی شک و شبہ
کا موجب نہیں ہو سکتا اور پورے یقین و وثوق کے ساتھ
یہ کہا جا سکتا ہے کہ احادیث نبویہ بالکل اسی طرح جمع اور
محفوظ و مدون ہوئی ہیں جس طرح قرآن کریم کو کتابی شکل
میں محفوظ و مرتب کیا گیا۔ لہٰذا حدیث کا مرتبہ قرآن کے
بعد ہے۔ قدرتی طور پر حدیث کی تدوین، ترتیب بھی قرآن
پاک کے بعد ہوئی۔

محدثین کرام نے حدیث کے پرکھنے میں بہت ہی احتیاط
امانت و دیانت سے کام لیا ہے۔ محدثین نہ صرف رجالِ
حدیث کے حالات جمع و محفوظ کئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی
شدت کے ساتھ پابندیاں کیں اور ان کے اخلاق و عادات
قوت و ضعف، دیانت و تقویٰ، علم حافظہ کے متعلق ان
کے معاصرین کے بیانات غرض ہر قسم کے معلومات
یکجا کر دئے اور ان کے بارے میں کوئی پاس و لحاظ نہ رکھا۔
خواہ وہ ان کے زمانے کے حاکم ہوں یا اپنے زمانے کے زاہد
ہوں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی بلکہ تمام کو مساوی
طریقے سے اُن راویوں کے روایتوں کو مع شرائط کے
قبول کیا گیا۔ راویوں کی چھان بین اور تحقیق کرنے میں
محدثین کرام کو بہت سی تکالیف اٹھانی پڑیں، لیکن
اس کے باوجود اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے
کام لیا کہ وہ واقعات آج اسلام کے لئے باعث فخر ہیں،
راویوں میں جلیل القدر خلفائے کرام اور بڑے بڑے
امراء بھی تھے جن کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر
محدثین کرام نے نڈر ہو کر کسی کی پرواہ نہ کی۔

(تاریخ دعوت و عزیمت)

قارئین! ملاحظہ فرمائیے کہ محدثین کرام نے احادیث
کے پرکھنے میں اتنی احتیاط سے کام لیا ہے کہ اپنے باپ
تک کا پاس نہیں کیا اور دینار و درہم کی بھی کچھ پرواہ
نہ کی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرات
کتنے بڑے نیک دل تھے اور اس معاملہ میں کتنے سخت تھے۔

محدثین عظام تدوین اور کتابت حدیث کے
تین دور قائم کئے ہیں۔ پہلا دور جبکہ ہر شخص نے اپنے
معلومات کو جمع کیا۔ یہ دور سنہ ۱۰۰ھ تک قائم رہا۔ دوسرا
دور سنہ ۱۰۰ھ سے سنہ ۱۵۰ھ تک قائم رہا اور تیسرا دور سنہ ۱۵۰ھ
سے تیسری صدی تک قائم رہا۔

پہلا دور صحابہؓ اور کبار تابعین کا دور ہے۔
دوسرا دور تبع تابعین کا
تیسرا دور۔ اصحاب صحاح ستہ وغیرہ کا ہے۔

پہلے اور دوسرے دور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں
تیسرا یعنی اصحاب صحاح ستہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس
دور میں سب سے پہلی کتاب سنہ ۱۵۸ھ میں موطا امام مالکؒ
ہے جس کو زمانی اور رتبی اولیت حاصل ہے۔ چودھویں

صدی تک جتنے بھی علماء گذرے ہیں ان میں موطا امام مالکؒ کے صحیح اور مستند ہونے پر کسی نے شک و شبہ نہیں کیا۔

دوسری صدی کے ائمہ کرام اور محدثین عظام نے تدوین حدیث کا کام نہایت وسیع پیمانے سے شروع کیا اور اسے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ تیسری صدی ہجری میں حدیث کے علوم کو کافی ترقی ہوئی۔ اسی صدی میں حدیث کے ایسے بڑے ذخیرے جمع ہوئے کہ جن کو کتاب اللہ کے بعد صحیح کتاب کا درجہ ملا۔ اُن میں سے صحاح ستہ کا مرتبہ مشہور و معروف ہے۔ جن میں دو ذخیرے ایسے ہیں جو اپنی ہمہ گیری اور وسعت میں اپنے اگلے پچھلوں پر فوقیت لے گئے۔ اُن میں ایک صحیح بخاری شریف ہے جس کو سلطان المحدثین حضرت امام ابوعبداللہ محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ نے تالیف فرمایا۔

دوسری کتاب صحیح مسلم ہے جس کو پیشوائے محدثین حضرت امام ابن حجاجؒ نے تالیف فرمایا۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ فن حدیث میں اُن لوگوں میں سے ہیں جو اکابرین میں شمار کئے گئے ہیں۔

صحاح ستہ کے اندر صحیح بخاری و مسلم کے بعد کا درجہ، جامع الترمذی کو حاصل ہے جس کو امام ابوعیسیٰ محمد (جو ترمذی کے لقب سے ملقب ہیں) نے تالیف فرمایا ہے۔

جامع الترمذی کی فضیلت کے متعلق خود امام مذکور کا کہنا ہے کہ اُس گھر میں حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا سایۂ رحمت ہوتا ہے، جس گھر میں کتاب مذکور موجود ہو۔

اسی طرح سنن ابو داؤد کو حضرت امام ابو داؤد، سلیمان ابن الاشعثؒ نے بمقام بغداد تالیف کیا ہے جس کو خود آپ نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش فرمایا۔ تو امام احمد بن حنبلؒ نے اس کتاب کی حسن بیانی کو دیکھ کر اظہار تحسین کیا۔

علمائے محدثین کی رائے کے مطابق سنن نسائیؒ بھی صحاح ستہ میں سے ہے جس کو ابو عبدالرحمان نے (جو امام نسائیؒ کے لقب سے مشہور ہیں) تالیف کیا ہے۔
اور علمائے حدیث نے ابن ماجہ کو کتب ستہ میں چھٹا درجہ دیا ہے جس کو حافظ ابو عبداللہ محمد ابن یزید ابن ماجہ نے تالیف کیا ہے۔

انہیں حضرات کی کدوکاوش اور تتبع و تلاش کا نتیجہ ہے کہ احادیث مدوّن ہوئیں۔ اور ہم حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک فرمان اور اُن کے ارشادات سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

خدا ہم کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم احینا علی الکتاب و السنۃ وامتنا مع الایمان والتوبۃ وحسن الخاتمۃ۔

عربی زبان اور اسکی اہمیت

از حافظ محمد ابراہیم
فردوسی ادونی
متعلم دارالعلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ

دنیا میں آج سینکڑوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق اپنے علاقہ تک محدود ہے، جن کے بولنے والے ہزاروں یا لاکھوں سے زیادہ ہیں۔ اس وقت دنیا کے اندر سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں انگریزی عربی اور اردو ہے۔ اول الذکر دونوں زبانیں بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہیں۔ اور یہ وہ زبانیں ہیں جو اپنے مولد و مسکن کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک مختلف فیہ رہا ہے کہ ان سینکڑوں زبانوں میں سے قدیم ترین کونسی ہے۔

بعضوں نے تو یہ کہا ہے کہ زبانوں میں سب سے قدیم عربی زبان ہے۔ اس دعوے کا ثبوت قرآن کے ازلی ہونے سے پیش کیا ہے و نیز آدم علیہ السلام کو جنت میں جو تعلیم بصورت اسماء سکھائی گئی وہ عربی ہی میں تھی۔ یہ قول یک حد تک قابل تسلیم بھی ہے۔ کیونکہ اس بات کے یقین میں ذرا برابر بھی شک نہیں کہ قرآن ازلی ہے اور آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد بھی اسی زبان میں تکلم کئے۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ دنیا کی اصل زبانیں تین[۳] ہیں، جس میں سے سامی بھی ایک زبان ہے۔ اسی زبان کی ایک شاخ عربی ہے۔ اسی سے متعلق حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ عربی زبان کا آغاز حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے ہوا۔ بظاہر دوسرے قول میں اور پہلے قول میں تعارض ہو رہا ہے اس کا دفعیہ یوں کیا گیا ہے۔ پہلا قول نفس عربی سے متعلق ہے، اور دوسرا قریش کی خاص لغت سے متعلق ہے۔ دوسری تحقیق کا موجد یعنی سب سے پہلے اس زبان میں بات کرنے والا یعرب بن قحطان ہے اور مکہ میں جس کے ہاتھوں اس کی داغ بیل ڈالی گئی وہ حرب بن امیہ ہے۔

عربی کی وجہ تسمیہ

عرب (بالفتحتین) کی وجہ تسمیہ کے بارے میں شاہ معین الدین ندوی نے دو بیانات نقل کئے ہیں۔

ایک یہ کہ عرب کے لفظی معنیٰ فصیح اللسان اور زبان آور کے ہیں اور چونکہ عرب اپنی فصاحت اور اپنی زبان آوری کے مقابلہ میں ساری دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنا نام عرب یعنی فصیح اللسان اور دوسری قوموں کا عجم یعنی ژولیدہ بیان رکھا تھا۔ دوسرا یہ کہ عرب

مشتق ہے عربہ سے جس کا معنیٰ دشت وصحرا کے ہیں۔ چونکہ
عرب کا بڑا حصہ دشت وصحرا پر مشتمل ہے اس لئے سارے ملک
کو عرب کہنے لگے۔ (ماخوذ از تاریخ اسلام)

عربی ادب کی ابتداء

عربی ادب کی ابتداء اس
لق ودق میدان سے
ہوئی جسکو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادیٔ غیر ذی زرع
کے لقب سے خطاب کیا تھا۔ اور وہ اسی بے آب وگیاہ میدان
میں نشو ونما پاتا رہا۔ ان بادیہ نشینوں پر قدرت کا یہ خاص احسان
تھا کہ تمام زور زبان کی خوبیاں ان لوگوں میں بدرجۂ اتم ودیعت
کر دی گئیں تھیں۔ جس کے سبب ان میں کا ہر کس وناکس زور بیان
و قدرتِ کلام پر پوری پوری قدرت رکھتا تھا۔ اس سلسلہ
میں اگر اس ادب کی ابتدائی منازل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات
بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عربی ادب اپنی شیر خواری کے زمانے میں
ویسا کچھ خاص نہ تھا، البتہ سلاست اور روانی اس میں ضرور
تھی۔ اس دور میں جو کچھ عربی سرمایہ تھا وہ تمام تر بصورت منظوم
جنگ وجدل، شراب وکباب، عشق ومعشوق، فرس وشتر،
دشت وصحرا کے ذکر پر مشتمل تھا۔

جب ان بادیہ نشینوں کے دماغ میں کبر وغرور پرورش
پانے لگا تو اللہ جل شانہٗ نے اپنے نبی کی بعثت کے بعد ان
پر اپنا کلام بلیغ نازل کرکے ایک طرف تو ان کے دماغوں کا
علاج کیا تو دوسری طرف عربی زبان کو زندگی اور ہمیشگی
بخشتے ہوئے عربی ادب کو پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

ہمیں ان تمام علمی سرگرمیوں کے ادبی باقیات
کو نظر انداز کر دینا چاہئے کیونکہ اس دور میں جو تعلیم
وتعلم کا طریقہ رائج تھا وہ صرف زبان تک ہی محدود
تھا۔ کیونکہ اس دور میں قرآن کریم کے سوا دوسری چیزوں
کو ضبط تحریر میں لے آنا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ یہ
امتناع دینی تعلیم کی ترویج واشاعت کے لئے بہت مفید
ثابت ہوا کیونکہ دوسرا کوئی علم ان کے سامنے موجود نہیں
تھا جس کو وہ حاصل کرتے جس کے سبب یہ لوگ قرآن کی
تعلیم کی طرف کشاں کشاں چلے آرہے تھے۔ اور اس کے
مفاہیم ومطالب کو سمجھنے کے لئے آنحضور صلے اللہ علیہ
وسلم کے ہر قول وفعل پر نظر رکھنے لگے۔ جسکی وجہ سے حدیث
کا وجود ہوا اور اس کی بھی تعلیم وکتابت ہوتی رہی۔
تقریبًا یہ سلسلہ بنو امیہ کے دور تک رہا۔ بہت کچھ تحقیق و
تدقیق کے بعد صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ گنتی کے چند کتابیں بصورت
تحریر ہمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ مگر ان کا ہونا نہ ہونے کے
مترادف ہے۔ کیونکہ یہ دور عربی ادب کا از روئے نثر کے
بالکل ابتدائی دور تھا۔ ابتدائی دور میں چیز کس نہج پر ہوتی
ہے، یہ کسی پر مخفی نہیں۔

اس دور کے اختتام کے بعد جب خلافت کی باگ
ڈور بنو عباسیہ نے سنبھالی تو انھوں نے اپنی تمام توجہات
عجمی علوم وفنون کو عربی زبان میں تدوین کرنے کی طرف
مرکوز کیا۔ اور اس کی نشر واشاعت کا خاص اہتمام کیا۔ خلفأ
کی نظر وتوجہ کا ثمرہ بہت اچھا برآمد ہوا۔ اس زمانے میں جس
قدر عربی ادب کو بصورت تحریر لے آیا گیا شاید اس سے قبل

کے زمانہ میں یہ صورت رہی ہو۔ یہی سبب تھا کہ آج دور کو عربی ادب کے اعتبار سے زرین دور کہا جاتا ہے۔ ایک طرف تو اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ رہا تو دوسری طرف شعر و شاعری کا بازار بھی بہت گرم تھا جیسے شعراء میں متنبی۔ ابو نواس وغیرہ ان لوگوں نے اس ادب کو وہی دلکشی بخشی جو اس سے قبل کے زمانہ میں دستیاب ہوتی تھیں۔ اس دور کے بعد سے آج تک اس کا ستارہ اسی آب و تاب کے ساتھ چمک دمک رہا ہے اور برابر دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ عربی ادب کی ابتدائی و انتہائی منازل کو پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ورود سے اس ادب میں کس باب کا اضافہ ہوا اس کو زیر تحریر لے آؤں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ عربی کی اہمیت قرآن سے کیا ثابت ہوتی ہے۔

عربی زبان اور قرآن

خدا خود کہہ رہا ہے کہ :۔ انا جعلناہ قرآنا عربیا ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا۔

اور ایک دوسرے مقام پر یوں فرما رہا ہے :۔

وانہ لتنزیل من رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین ٥	یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے بذریعہ جبرئیلؑ کے آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرائیں۔

علاوہ اس کے ایک اور وجہ بھی ہے جس کو تاریخ ادبیات عربی کے مصنف نے یوں بیان کیا ہے :۔

"قرآن عربی یادگار کے لحاظ سے جو نثر کے اسلوب میں شاندار شاعرانہ انداز لئے ہوئے ہے۔ اس میں عام ارتقائے ادب کی نسبت بعض خوبیاں تو نہایت ہی شاندار ہیں۔ مسلمان متفقہ طور پر اس بات کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں کہ کوئی کتاب نہ تو اس کے متن کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ اس کے اسلوب بیان کا (اور خود اس کتاب کا دعویٰ بھی ہے) مگر بڑا نے شعر و سخن کی طرح یہ کتاب بھی جتنا ادبی کمالات کی وجہ سے ممتاز ہے اتنا ہی اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ اور اسلام کے راسخ الاعتقاد لوگ اس قسم کی ہر کوشش کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ ترجمہ میں اس کی زبان کی دلکشی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ نحوی تراکیب کے حقیقی معنی بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ فصیح و بلیغ جملے بے ربط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ صرف چند بے جوڑ تصورات ہی نظر آتے ہیں۔ جن میں نہ تو کوئی فنی خوبی ہے اور نہ کوئی زندگی۔ قرآن پاک خود شاہد ہے کہ اسے عربی میں کیوں نازل کیا گیا؟ وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اور زبان اتنے محاسن اسلوب بیان اور جامعیت کے لحاظ سے اس حامل نہیں کہ وہ مطالب قرآن کا بوجھ اٹھا سکے"۔

اسی مفہوم سے متصل ایک انگریز مفکر کی رائے ملاحظہ کیجئے جس کو اسلم جیراجپوری نے "تاریخ الامت" حصہ ششم میں ثبت کیا ہے۔

"یہ واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا ہے جس وقت آپ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو اس وقت حضرت عمرو ابن العاصؓ نے سرزمین مصر کے متعلق دربارِ خلافت میں ایک تحریر بھیجی تھی جو اب تک علم و ادب میں مشہور ہے۔ فرانسیسی ادیب موسیو اوکتاف اوزان نے تو اس کو دنیا کی زبانوں میں بلاغت کا ایک حیرت انگیز نمونہ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ معمورۂ عالم کے جملہ مدارس میں اس کو پڑھانا چاہئے تاکہ طلباء کو اشیاء کے حقائق بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ یہ پورا خط النجوم الزاهرة فی اخبار مصر والقاهرة میں ثبت ہے۔ مذکورہ بیانات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو مقبولیت عربی زبان کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہونے سے دین و دنیا کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟

دین قرآن کے نازل ہونے کے بعد دین میں تو ایسی چیزوں کا ورود ہوا جو رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے لئے نجات کا باعث بن سکتی ہیں۔ اگر امت مسلمہ اس کو اپنا شعار بنالیں۔ وہ ہے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر دنیا کے علوم جیسے آج ہم دیکھ رہے ہیں یہ تمام قرآن ہی کے مرہون منت ہیں۔

دنیا اور دنیا کا یہ فائدہ ہوا کہ جن کے دماغوں سے نخوت و غرور ٹپک رہا تھا اس کا ازالہ کیا اور انہیں ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ وہ لوگ اس کی حقانیت کے قائل ہو کر رہے مختصراً ایک تاریخی واقعہ درج کر رہا ہوں، جو ماقبل مضمون کی تصدیق کر رہا ہے:۔

"حضرت لبید رضی اللہ عنہ، جو زمانہ جاہلیت کے مشہور و معروف شاعر رہ چکے ہیں، حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنے دورِ خلافت میں عامل کوفہ کو لکھا کہ لبید اسلام لانے کے بعد جو اشعار کہے ہوں وہ بارگاہِ خلافت میں بھیجدئے جائیں۔ جب عامل کوفہ نے حضرت لبید سے دریافت فرمایا تو لبید نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ اور آل عمران نازل فرما کر مجھے شعر گوئی سے بے نیاز کر دیا ہے۔"

عربی زبان کا بگاڑ

کہا جاتا ہے کہ ہر عروج میں زوال کی کارفرمائی نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح جب یہ بادیہ نشیں اس میں اس قدر آگے بڑھے جو اوروں کی آنکھ میں ان کی ترقی کانٹا بنکر کھٹکنے لگی تو صیہونی تحریک نے دیکھا کہ عربوں کی ترقی دن بدن بڑھتے جارہی ہے تو انہیں اس بات کی سخت تشویش دامنگیر ہوی کہ وہ کونسی خوبی ہے جس کے سہارے یہ لوگ ہر جگہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے جارہے ہیں۔ بہت کچھ تحقیق و تدقیق کے بعد آخر کار ان کے ذہن رسا نے اس بات کو انگیز کر ہی لیا کہ وہ خوبی صرف ان کی وہ زبان ہے جس میں ان کا تمام تہذیبی و تمدنی سرمایہ موجود ہے۔ یہیں سے صیہونی تحریک عربوں کو ان کی زبان سے برگشتہ کرنے کے درپئے ہوگئی کیونکہ بقول شکسپئیر "اگر تم کسی قوم کو

نیست ونابود کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان سے ان کی زبان کو ختم کرو"۔

لہٰذا اس تحریک والوں نے عربوں کا استیصال کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے ایک نئی تحریک "ترقی" کے نام سے شروع کی اور ان کی یہ کوشش کارگر ثابت ہوی۔ ترقی کے نام سے انہوں نے جو گل کھلائے وہ درج ذیل ہیں۔

(کہیں تو لفظ 'ث' کو 'ت' سے بدل کر پڑھنے لگے جیسے کثیر سے کتیر اور کہیں تو ذ کو د سے بدل کر پڑھنے لگے جیسے ذقن سے دقن اور کہیں تو ج کو گ سے بدل کر پڑھنے لگے جیسے جدًا سے گدًا)

غرض کہ اکثر وبیشتر الفاظ میں انہوں نے ترمیم وتنسیخ کر ڈالی، اور عربوں نے اس کو نہایت عمدگی سے قبول کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی زبان بالکل تبدیل ہو گئی۔ جس کی وجہ سے قرآن مجید کا سمجھنا ایک غیر عرب ہی کے لئے نہیں بلکہ خود عربوں کے لئے آج مشکل ترین مسئلہ بن چکا ہے۔ اگر عرب لوگ اس طرف توجہ نہ فرمائیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ وناصر ہے۔

کیونکہ ایک عربی بچہ جس کی زبان ان الفاظ سے مرطوب ہو چکی ہو اگر وہ قرآن پر نظر کرے تو وہ ان الفاظ کو جو قرآن میں ہے بالکل اپنے سے بیگانہ پائے گا۔ اور ان سے وہ سرمایہ جس پر ان کی ترقی کا مدار موقوف تھا وہ ختم ہوتا جائے گا اور ان کی ترقی موقوف ہو جائے گی۔ اور ان کے مخالفین ومعاندین کی تمنائیں وامیدیں برآئینگی اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے چلے جائیں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عربی ادباء کو زبان میں پھیلتی ہوی ان بے اعتدالیوں کے سمجھنے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔　　آمین ثم آمین۔

سلسلہ صفحہ ۱۲۳ اسلام کا مقصد امن وامان قائم کرنا ہے، لیکن آج دنیا میں فتنہ وفساد، لوٹ مار، سفاکی، عام ہو چکی ہے جس کی وجہ سے خصوصًا مسلمان مخمصے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ یہ تمام حادثات جو بلائے ناگہانی بن کر ہم پر نازل ہو رہے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم نے اسلام کے نظام عمل واحکام کو پس پشت ڈال دیا۔ یاد رکھیے! — جبتک ہم احکام الٰہی واقوال رسول مولیٰ کو مشعل راہ نہ بنائیں گے اس وقت تک غیر محفوظ وغیر مامون رہیں گے۔

اگر آج بھی ہم اسلام کے نظام عمل کو اپنا لیں تو بعید نہیں کہ ہماری خستہ حالت دور ہو جائے اور پر امن دور واپس لوٹ آئے۔

مولانا سید شاہ ابوالحسن علی ندوی زید مجدہٗ کا خیر مقدم

ادارہ

عالم اسلام کی مشہور و معروف شخصیت عالیجناب الحاج مولانا سید شاہ حضرت **ابوالحسن علی ندوی** مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (U.P) اِس سال ماہ جولائی کے اواخر میں جناب ٹی۔ عبدالواحدؔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ مدراس کی دعوت پر شہر مدراس آئے۔ موصوف کو "انوارِ اقطابِ ویلور" کے مطالعہ نے اس مقدس خاندان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا کردیا تھا۔ اسی لئے مدراس آنے لگے تو اپنے پروگرام میں ویلور، دارالسرور کو داخل کرلیا۔ مدراس کے پنج روزہ اجلاس کے بعد ۲؍ اگست سنہ ۱۹۷۰ء یکشنبہ کی صبح ویلور تشریف لائے۔

جیسے ہی آپکی کار مکانِ حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ میں داخل ہوئی ناظم دارالعلوم لطیفیہ عالیجناب مولانا حضرت ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری دامت برکاتہم العالی B.A، اساتذۂ کرام، طلبائے عزیز، جو اپنے مخصوص یونیفارم میں ملبوس تھے آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مولانا دارالعلوم کی دلکش عمارت، پر فضا مقام اور طلباء کے ڈسپلن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر آپ حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے، جہاں عالیجناب عزت مآب اعلیحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین مکانِ حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ سرپرست دارالعلوم لطیفیہ نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ مولانائے محترم خانقاہ میں بہت دیر تک اقطابِ ویلور قدس اسرارہم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ آپ نے زبدۃ العارفین حضرت محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری المشہور بہ **قطبؒ** ویلور قدس سرہ العزیز کے دعوت نامہ پر انتہائی حیرت کا اظہار فرمایا جس میں ملکۂ برطانیہ کوین وکٹوریہ کو دعوتِ اسلام دی گئی تھی۔ مولانا نے کہا کہ یہ عظیم کارنامہ آپ کے جذبۂ ملی، جرأت ایمانی اور عارف باللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس خط سے بھی آپ بہت متاثر ہوئے جس میں حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز نے مفتی بلہاری کے جواب میں مولانا اسمٰعیلؒ شہید دہلوی کے کافر ہونے کی نفی کی تھی نیز مخزن السلاسل تصنیف حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری بیجاپوری قدس سرہٗ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کو تو صرف آٹھ دس سلسلوں کا علم ہے لیکن آج ۹۱ سلسلوں کا پتہ

چلا۔ اس کے بعد آپ نے جواہر الحقائق، جواہر السلوک فصل الخطاب وغیرہ دوسرے مطبوعہ وقلمی نسخوں کو ملاحظہ فرمایا۔

ناشتہ اور چائے نوشی کے بعد آپ دار العلوم تشریف لائے جہاں تمام اساتذۂ کرام، طلبائے عزیز اور معززین شہر آپ کے منتظر تھے۔ دار العلوم کے دلکش مزین وسیع ہال میں عالیجناب مولانا مولوی اعلیحضرت ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین مکان حضرت قطب ویلور کی صدارت میں **جلسۂ استقبالیہ** ترتیب دیا گیا۔ جس میں حافظ محمد ابراہیم کی تلاوت قرآن پاک، اور نعت خوانی کے بعد جناب مولانا سید مصطفٰے حسین صاحب بخاری کڈپوی مدرس دار العلوم لطیفیہ نے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سپاسنامہ

بقدوم میمنت لزوم عالیجناب الحاج مولانا حضرت سید شاہ ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

مرحبا صد مرحبا اھلاً وسھلاً

عزت مآب!

ایک ایسی مقدس سرزمین پر جو اپنے جلو میں تین سو سالہ زرین تاریخ رکھتی ہے آپ کا آنا مبارک ہو۔

جناب محترم!

یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں سے **اقطاب** ویلور قدس اسرارہم نے اپنے ہر دور میں بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کی، اپنی پیہم کوششوں اور جانفشانیوں سے جنوب کی تاریکی کو روشنی سے بدلتے ہوئے اس خطہ کو علم کی حقیقی لذتوں سے روشناس کرایا۔ جنوبی ہندوستان میں ان کی علمی، عرفانی، ادبی اور اصلاحی خدمات آپ اپنی مثال ہیں۔

ہندوستان کی قدیم ترین درسگاہ **ام المدارس دار العلوم لطیفیہ** جس میں آپ اس وقت فروکش ہیں تقریباً **تین صدیوں** سے طالبان علوم شریعت ومعرفت کو سیراب کرتا آرہا ہے۔ اسی دار العلوم سے فارغ شدہ طلبا نے جنوب کی یخ بستہ زمین کو لہلہاتے ہوئے سبزہ زار دل

بدل دیا۔

فضیلت انتساب!

اس دارالعلوم کی کچھ خاص اپنی روایات ہیں۔ جہاں طلبا کو علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی اور تزکیۂ نفس کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور اس دارالعلوم سے فارغ ہونے والے طالب العلم کے ایک ہاتھ میں جام شریعت، تو دوسرے ہاتھ میں سندانِ عشق ہوتے ہیں۔

ایسے تاریخی اور متبرک مقام پر آپ کی تشریف آوری دارالعلوم، اسکے مربیین، اساتذہ اور طلبا کے لئے باعث مسرت ہے اور یہ دن یادگارِ زمانہ رہے گا۔

فضیلت مآب! آپکی شخصیت عالم اسلام کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ آپ کو دنیائے اسلام میں ایک روشن دماغ اسلامی مفکر، دوراندیش مورخ، دردمند معلم اور سلیم الطبع قائد کی حیثیت سے کون نہیں جانتا؟ ہمیشہ ہم نے محسوس کیا کہ آپکے مقدس سینہ میں قوم وملت کی سچی تڑپ اور ان کی تعمیر وترقی کا صحیح جذبہ موجزن رہا ہے، کئی مرتبہ آپ نے عرب وعجم کے مختلف گوشوں میں جاکر مسلمانوں کو مذہب سے قریب تر کرنے کی کوشش کی اور مذہب اسلام کو صحیح انداز میں عوام تک پہنچانے میں کوشاں رہے۔ جس طرح آپ کی بلند پایہ تصانیف مقبول عام ہیں آپ کی عظیم شخصیت بھی اس سے زیادہ مقبولیت کی حامل ہے۔ آپ کی بلند پایہ معرکۃ الآرا تصانیف نے عالم اسلام میں تہلکہ مچادیا۔

خصوصًا عالم عرب میں مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِيْنَ نے مدوجزر کی سی کیفیت پیدا کردی۔ آپکی علمی قابلیت ذہنی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے اور آپکی تصانیف کے ایک ایک حرف کو آج دنیا داد دے رہی ہے۔ آپ نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ ہندوستان ہی کو نہیں عرب دنیا کو بھی ایک نیا فکر اور سوچنے کا انوکھا انداز دیا۔ ہندوستان میں آپ کی عظیم خدمات خصوصًا ندوۃ العلماء کی سرپرستی اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے آپ کی دینی و اصلاحی کوششیں لائق صد ستائش وقابل رشک ہیں۔

آج جبکہ آپ ہمارے درمیان جلوہ فگن ہیں، ہماری دلی خواہش اور تمنا ہے کہ آپ اپنی صواب رائے، تدبر صحیح پاکیزہ جذبات اور فکر انگیز خیالات سے مستفید فرمائیں۔

دعا ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں آپ کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ اور قوم وملت کو آپ جیسے رہنماؤں سے معمور رکھے آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

منجانب اساتذہ وطلبائے دارالعلوم لطیفیہ

(مکانِ حضرت قطب ویلور قدس سرہ)

بروز یکشنبہ ۲۸ جمادی الاول ۱۳۹۰ھ م

۲؍ آگست سنہ ۱۹۷۰ع

سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے

مولانا نے اپنے خاص اندازِ فکر میں فرمایا:۔
"مدت سے میرے دل میں اس بات کی تمنا تھی کہ
اس مقدس مقام کی زیارت کروں، خدا نے میری اس خواہش
کو آج پورا کیا۔ میں یہاں عالم نہیں بلکہ ایک طالب علم کی حیثیت
سے آیا ہوں۔ ان محترموں نے میرے ساتھ جو سلوک اور
تکریم کی ہے بہت شرمندہ ہوں۔ پھر آپ نے غالب کا یہ
شعر پڑھا ؎ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

آپ نے مشائخ صوفیہ صافیہ کے سلاسل پر روشنی
ڈالتے ہوئے طلباء سے کہا "عزیز طالب العلمو! تم ایسے مقام
پر تعلیم پا رہے ہو جہاں علوم ظاہری کے ساتھ تصفیۂ باطن
کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم
یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم
الکتب والحکمة اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہوئے آپ
نے فرمایا کہ انسان کو علم کے ساتھ تزکیۂ نفس کی تعلیم
ضروری ہے۔ تم تصوف کو شریعت کے تابع بناؤ، چونکہ
مجدد الف ثانیؒ نے شریعت کو تصوف پر فوقیت دی ہے
اسی لئے وہ مجدد کہلائے۔

آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ انسان کے لئے دو
چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک توکل دوسرا صبر
جب تک انسان اپنے اندر ان دو چیزوں کو جمع نہیں کرتا
اس وقت تک اس کا کمال معراج کو پہنچنا ناممکن ہے۔

آپ نے اسی خاندان کے بزرگوں کی مثال دیتے
ہوئے کہا کہ حضرت سید شاہ عبد اللطیفؒ قادری
بیجاپوری، حضرت قربیؒ اور حضرت قطب ویلور قدس اسرارہم
کے اندر کتنا صبر و توکل تھا۔ ان مقدس ہستیوں نے صرف
ان دو جوہروں کے ذریعہ بھٹکی ہوئی کثیر مخلوق کو سیدھی
راہ پر لا کھڑا کیا۔ لیکن آج جب علماء سے مسلمانوں کے
بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ زمانہ
بہت خراب ہے وہ ہماری باتوں پر کان نہیں دھرتا۔
یہ ان کی بیکار باتیں ہیں۔ یاد رکھو! جب تک تم زمانے
کو نہ جھنجھوڑو گے راہ راست پر نہ آئیگا۔ کیونکہ زمانہ بہرہ
ہے اس کے کان میں چیخ کر بولو۔ اور زمانہ اندھا ہے
اس کا ہاتھ پکڑ کے منزل کی طرف لیجاؤ۔ نیز اس کی ناک
زمین پر رگڑ کے اس طرح چیخ کر بولو کہ وہ پکار اٹھے
'امنّا امنّا ـــــ'!

سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:۔
ماشاء اللہ تم اچھے خاندان کے نونہال معلوم ہوتے ہو،
اب صرف تم سے ایک بات کہونگا وہ یہ کہ تم کسی ایک
فن کے اندر مہارت حاصل کرو اور اس کے استاد بن
جاؤ، پھر دیکھو کہ تمہارے سامنے زمانہ خود بخود کسطرح
کھنچا چلا آئے گا۔

زبدۃ العارفین حضرت رکن الدین محمد سید شاہ ابو الحسن

قادری قرنی قدس سرہٗ کو لیجیے کہ آپ کو فارسی پڑھنے کا شوق تھا اور ان کو اپنی طبیعت کے موافق قابل استاد بھی ملے، ان سے اس طرح استفادہ کیا کہ خود فارسی کے ایک جید استاد بن گئے۔

اور باقر آگاہؒ جیسے باکمال انسان نے آپ کی تلمذی اختیار کی۔ آپ کے مرید و خلیفۂ خاص بن گئے، یہ سب کیسے ہوا۔ کثرتِ شوق کی بنا پر — تم بھی شوق پیدا کرو اور زمانے سے اپنا لوہا مناؤ۔

اس کے بعد مولانا نے دُعا پر اپنی تقریر ختم فرمائی۔

مولانائے محترم کی دلچسپ اور نصائح سے بھرپور تقریر کے بعد

عالیجناب حضرت ابوالحسن صدر الدین سید **شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری** مدظلہ العالی ناظم دارالعلوم لطیفیہ مکان حضرت قطبؒ ویلورؒ نے آپ کی بلند پایہ تقریر کی جانب طلبائے عزیز کی توجہ مبذول فرماتے ہوئے محترم و مکرم عالیجناب الحاج مولانا حضرت سید شاہ ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۱۰۶) جناب الحاج بی عبدالواحد صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ و بانی ادارۂ تحقیقات اسلامیہ و رسن آمبور، جناب مدبکیار مولوی محمد حبیب اللہ صاحب اور تمام کا شکریہ ادا فرمایا۔

اجلاس کے اختتام کے بعد ناظم صاحب دامت برکاتہم العالی کے ہمراہ آپ نے درگاہ شریف میں حاضری دی جہاں غوث و اقطاب محو آرام ہیں اور کچھ دیر عظیم البرکت اعلحضرت قبلہ مدظلہ العالی کے ساتھ مراقب رہے۔ زیارت سے مشرف ہونے کے بعد اپنی انبساطی و انشراحی کیفیت و قلبی تاثر کا اظہار فرمایا۔ تمام سے وداعی ملاقات کی، اور اپنی اعلےٰ شخصیت کے گہرے نقوش ہمارے قلب پر مرتسم فرماتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

ادارہ

بسمہ تعالیٰ عزاسمہ

امن کا راز

از
یس ۔ یم ۔ کمال اللہ حکوری
چتوری
متعلم دارالعلوم لطیفیہ ویلور

دنیا کے تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں ساری دنیا پر ظلمت وجہالت کے بادل منڈلا رہے تھے محبت و انسانیت کا فقدان تھا اور ہر جگہ قتل و غارت گری عام تھی۔ ایک انسان دوسرے انسان کے خون سے کھیلنا معمولی بات سمجھتا تھا اور ساری دنیا امن و امان سے بالکل ناآشنا تھی۔ بالخصوص خطۂ عرب ضلالت وجہالت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبدالقیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا سنہ ھ تک مضری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رُخ نہیں کر سکتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہو چکا تھا مدینہ سے مکہ تک کا سفر خطرناک تھا۔ اور اب بھی ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ ہجرت کے پانچ چھ برس بعد بھی شام کے تجارتی قافلے دن دہاڑے لوٹ لئے جاتے تھے۔

یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دارالاسلام کی چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو ملک کے امن و امان کی بشارت دیتے تھے کہ "ایک زمانہ آئے گا جب مقام صنعاء سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی اور خدا کے سوا کسی کا اس کو خوف نہ ہوگا"۔ تو لوگوں کو تعجب آتا تھا۔ سنہ ۹ھ میں ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ "عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلہ بے نگہبان جایا کرے گا"۔ اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آسکتا تھا"۔ (سیرت النبیؐ)

خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ سے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا:۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔

ان کو چاہئے کہ اس گھر کے مالک کو پوجیں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور بدامنی کو دور کرکے امن بخشا

خود داعیٔ اسلام کو ان کے ظلم وستم سے دوچار ہونا پڑا کہ عام الحزن کے تین سال بعد اطراف کے قبائل سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے سایۂ امان میں لے کر مجھے اتنا موقع فراہم کردے کہ میں خدا کی صدا کو لوگوں کے گوش گذار کرسکوں۔

لیکن کوئی متنفس ایسا نہیں ملا کہ اس انسان کامل کو

اپنی آغوشِ پناہ میں جگہ دے اور خود مسلمانانِ عرب
کی بھی یہی خستہ حالت تھی، کہ تلاشِ امن میں افریقہ اور
حبش کے صحراؤں میں دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ جو لوگ
بوجہ ناداری و مفلسی کے عرب ہی میں قیام پذیر ہوئے تو
ان بے چاروں پر ظلم و جبر کی تلواریں نیام سے باہر آگئیں،
اسی حالت کو قرآن کریم ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

وَاذْكُرُوٓا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ

یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اچک نہ لیں۔

غرض اس کس مپرسی کے عالم میں انسان کا
کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اس تاریک و پُرخطر دور میں
وحدہٗ لاشریک کا رحم و کرم بصورتِ اسلام جلوہ
گر ہوا۔ جوں ہی اسلام اپنی روحانی و نورانی کرنوں
کو لے کر نمودار ہوا تو ساری کثافت و غلاظت کا
خاتمہ ہو گیا اور سب سے پہلے امن و سلامتی کا پیغام
لانے والا اسلام ہی ہے اور اگر اسلام کی لغوی تحقیق
کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کا مادہ س، ل، م، ہے جس
کے معنی سلامتی کے ہیں۔ اور "امن" سلامتی کا مشتاق
ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ صدیوں سے لوٹ مار
سفاکی و درندگی کا بازار گرم تھا۔ اور خونِ انسان سیلاب
کی طرح رواں تھا۔ لیکن اس مخدوش حالت میں کسی
مذہب یا سوسائٹی یا کسی رہبر و ریفارمر نے اس کی جانب
خیال و گمان تک بھی نہ کیا۔ اور نہ کسی گوشے سے یہ اعلان
ہوا کہ ظلم و ستم اور خوں ریزی کو ترک کر دو، اور رحم و
کرم، امن و سلامتی کو اپنا شعار بناؤ۔

لیکن اسلامی تعلیمات کو ملاحظہ کیجئے، ارشاد باری
ہے کہ خدائے تعالیٰ زمین میں فساد برپا کرنے والوں
کو پسند نہیں فرماتا۔

غرض اسلام نے ان احکام کی ہدایت ہی نہ کی
بلکہ اس پر قائم رہنے کی سخت تاکید کرتے ہوئے اس کو
مسلمانوں کے لئے اہم فریضہ قرار دے دیا ہے۔

اور دیگر بیرونی ممالک میں بھی بدامنی و لوٹ گھسوٹ
قتل و غارت گری، اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ
وحشیانہ سلوک کرنا ایک طرۂ امتیاز بن چکا تھا۔ مثلاً روم
و فارس یہ ہر دو عظیم الشان حکومتوں کے ماتحت زرخیز
و سرسبز شہر تھے۔ یہاں تک کہ رومیوں نے ملکِ شام پہ
اپنا تسلط جما رکھا تھا اور وہاں کے چھوٹے چھوٹے
قبائل ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے تھے۔

لیکن اس عالمِ گیتی پہ اسلام کا یہ کرشمہ دیکھیئے کہ اس
غلامی کی زنجیر کو اور ادنیٰ و اعلیٰ کے فرق کو حرفِ غلط
کی طرح مٹا دیا اور ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک امن و
سلامتی کے علم نصب کر دئے اور اس کے برخلاف اگر کوئی
بدعہدی و بدامنی کرتا ہے تو اس کے لئے جزا و سزا خود

کتاب اللہ نے مقرر کردی ہے چنانچہ ارشاد رب العزۃ ہے اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ الخ بلاشک کہ جو لوگ اللہ و رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ان کی یہ کوشش ہے کہ زمانے میں فساد برپا کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا سولی پہ چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ و پیر مخالف جانب سے کاٹ دیا جائے یا جلا وطن کر دیا جائے۔ ان کے لئے دنیا میں یہی ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

آیت مذکورہ سے اس امر کی تشریح بخوبی ہوتی ہے کہ جو شخص کتاب اللہ و سنت رسول کے بتائے ہوئے ارشادات و احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گویا وہ بدبخت انسان اپنے ہی خدا اور رسول سے بغاوت کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس میں یہ باریکی بھی ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم رہے اور ظلم و استبداد کا بازار ختم ہو جائے اور اس کے متعلق بہت سے احادیث شریف و واقعات شاہد ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت سے کس کو مجال انکار کہ فتح مکہ کے موقعہ پہ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی قدرت حاصل تھی، اگر آپ کا صرف اک اشارہ ہو جاتا تو مکہ کی گلیاں خون انسانی سے رنگین ہو جاتیں اور کفار مکہ نیست و نابود ہو جاتے لیکن اس کے باوجود سرفروشان اسلام نے جن پہ ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے تھے اس کو یاد کرتے ہوئے بھی اپنے دشمنوں پہ تلوار تک نہ اٹھائی۔ آخر کیوں؟ صرف حسن خلق اور بقائے امن کے لئے۔ پھر دربار پر جمال سے یہ صلائے عام ہوا کہ

لا تثریب علیکم	آج تم پہ کوئی الزام نہیں
الیوم یغفر اللہ لکم	خدا تمہارے گناہوں کو
وھو ارحم الراحمین	معاف کرے وہ سب سے زیادہ
اذھبوا انتم الطلقاء	رحم کرنے والا ہے جاؤ تم

سب آزاد و مامون ہو۔

اسی طرح جب فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب دوبارہ بیت المقدس پہ قابض ہوئے، تو عام طور سے معافی کا اعلان کر دئے۔

لیکن جب یہی عیسائی لوگ بیت المقدس کو فتح کئے تھے تو ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دئے، اسکے برعکس فاتح بیت المقدس کی فیاضی اور امن پروری کا یہ عالم تھا کہ فتح کے بعد تلوار کو جنبش تک نہ دی اور اتنا ہی نہیں بلکہ جو غریب عیسائی تھے انہیں روپیوں سے مالا مال کر دیا۔

ایسے واقعات تاریخ کے باب میں جلی حروف سے لکھے گئے ہیں۔ کوئی مثال کہیں ایسی نہیں ملے گی کہ اسلام نے کسی پہ تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خود کے تحفظ اور مدافعت کے لئے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ مگر بلا ضرورت کسی ضعیف و ناتواں پہ بھی میان سے تلوار نکالنے کا حکم نہیں۔ تو بتائیے کہ جنگ کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے۔

(بقیہ بر صفحہ ۱۱۵)

۸۹/۹۲

حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کے جواہر پارے

از
حافظ محمد ابراہیم
ادہولی
متعلم دار العلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب
ویلور

شیراز کی تاریخ جتنی پرانی ہے اتنی ہی نئی بھی ہے کیونکہ اس سرزمین نے ایسی نادر ہستیوں کو جنم دیا ہے جو تاریخ میں آپ اپنی مثال رکھتے ہیں۔ جن سے آج بھی شیراز کی تاریخ زندہ و جاوید ہے۔ انہیں ہستیوں میں سے خواجہ حافظ شیرازیؒ کی بھی ایک بلند پایہ شخصیت رہی ہے۔ آپ کے دیوان کے بعض وہ منتخب اشعار جس میں آپ نے حکمت و دانائی کے انمول موتیوں کو پیش کرکے انسانیت کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۱) بمئی سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود زِ راہ و رسمِ منزلہا

اگر مرشدِ کامل تجھے اپنی گدڑی کو شراب میں ڈبو دینے کا حکم دے تو اس حکم کی تعمیل کر، کیونکہ وہ منزلِ مقصود کی پیچ پیچ راہوں سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔

(۲) نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را ،

اے دوست نصیحت کو بغور سن کیونکہ نیک بخت پیرِ دانا کی نصیحت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔

(۳) بحسن و خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر
بہ بند و دام نگیرند مرغِ دانا را ،

اہل اللہ کو حسن و خلق سے اپنا بنا سکتے ہیں کیونکہ دام و دانہ سے مرغِ دانا کا شکار نہیں ہو سکتا۔

(۴) آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا

دنیا کی آسائش کا راز صرف ان دو چیزوں میں ہے، ایک تو دوستوں کے ساتھ مہربانی و شفقت کرنا دوسرا دشمنوں کے ساتھ خاطر و مدارات کرنا۔

(۵) ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ شخص ہمیشہ زندہ رہے گا جس کا دل عشق سے زندہ ہوگیا۔ ہم عاشقوں کی ہمیشگی صفحۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثابت ہو چکی ہے۔

(۶) عیبِ مستاں مکن اے خواجہ کزیں کہنہ رباط
کس ندانست کہ رحلت بچساں خواہد بود

اے دوست اس دیرکہن میں اللہ والوں کی عیب گیری نہ کر کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ اپنا آخری انجام کس حال میں ہوگا۔

(۷) عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

عنقا کسی شخص کے دام میں نہیں آتا۔ جو شخص اسکے،
شکار کے لئے آمادہ ہوا ہمیشہ اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے
(شاعر عنقا سے اللہ کی کنہ ذات کا استعارہ کیا ہے۔

(۸) گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آری شود ولیک بخون جگر شود

کہتے ہیں کہ صبر کرنے سے پتھر بھی لعل ہو جاتا ہے لیکن صبر
کرنے کے لئے بہت محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔

(۹) گر جاں بدہد سنگ سیہ لعل نگردد
با طینتِ اصلی چہ کند بد گوہر افتاد

سیاہ پتھر لعل نہیں ہوتا اگرچہ اس کے پیچھے اپنی
تمام عمر کیوں نہ صرف کر دے۔ کیونکہ جس کی فطرت
میں برائی رچ بس گئی ہو اس کی اصلاح ممکن نہیں۔ شاعر
سنگ سیاہ سے بری فطرت والے اور لعل سے اچھی فطرت
والے کا استعارہ کیا ہے۔

(۱۰) طریق عشق پر آشوب و فتنہ ہست اے دل
بیفتد آنکہ دریں راہ با شتاب رود

محبّت کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ لہٰذا اے دل تو اس مرحلہ
سے با احتیاط گذر کیوں کہ یہاں کے پھول بھی چبھتے ہیں خار
کی صورت، وہ شخص منزل مقصود کو نہیں پاتا جو جلد بازی
سے کام لیتا ہے۔

(۱۱) ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں کہ میں یہ دَور ترقی میں
کیا دیکھ رہا ہوں کہ تمام عالم شر و فتنہ و فساد سے معمور ہے
چاہیئے تو تھا کہ امن، اتفاق و اتحاد ہوتا ——— !

ممتحن دار العلوم لطیفیہ

ادارہ

جنوبی ہند کے ممتاز حکیم شفاء الملک مولانا مولوی الحاج حکیم محمد عبد الباری صاحب قصبہ پرنام بٹ کے مشہور علمی خاندان کے ایک باکمال فرد، فقیہ الامت مفتی و قاضی بشیر الدین احمد[ف] صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلف اکبر تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں آپ قصبۂ پرنام بٹ میں پیدا ہوئے۔ آپکی ابتدائی تعلیم اپنے نانا مولوی محمود صاحب اور اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی۔ درس نظامی کی تکمیل مدرسۂ معدن العلوم وانمباڑی سے کی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں طبیہ کالج دہلی تشریف لے گئے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب، حکیم محمد احمد خان صاحب حکیم فرید احمد عباسی صاحب سے طبی تعلیم حاصل فرمائی۔ پھر شفاء الملک حکیم نظام الدین صاحب اجمیری کی خدمت میں رہ کر کامل ایک سال تک مطب اور رموز فن میں آپ سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ اس کے بعد علمی و فنی لازوال دولت سے مالامال ہو کر اپنے وطن لوٹے اور گھر ہی پر مطب شروع کیا، بہت جلد آپ نے طبابت میں شہرت حاصل کی۔ آپ کا مطب مرجع خاص و عام ہو گیا۔

آپ نے بہت سے لاعلاج مریض جو زندگی سے مایوس ہو چکے تھے ان کو صحت و تندرستی کی بے انتہا مسرتوں سے ہمکنار کر دیا۔ آپ کی تشخیص نباضی اور حذاقت آپ اپنی مثال تھی۔

حکیم صاحب کو علوم دینیہ سے خاص شغف تھا۔ علمی اور فنی قابلیت تو آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ درس نظامی کی تقریباً تمام کتابوں پر اچھا عبور تھا۔ اور معقولات سے گہری دلچسپی تھی۔ موصوف کو مدارس دینیہ سے کچھ نہ کچھ علمی رشتہ رہا کرتا تھا۔ مدرسہ دار العلوم پرنامبٹ میں منتہی طلباء کی دو ایک کتاب آپ ہی کے ذمہ رہتی تھی اور ہمیشہ سے آپ اس کے ممتحن بھی رہے ہیں۔

تقریباً بارہ سال تک آپ دار العلوم لطیفیہ کے ممتحن رہے، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے علاوہ دوسرے زمرات کے سوالات کے بعض پرچے تیار کرتے اور ان کے جوابات کی کاپیاں آپ ہی جانچتے تھے۔

حکیم صاحب انتہائی نرم مزاج، متواضع، مخلص اور باخدا بزرگ تھے۔ دو مرتبہ آپ مع اہل و عیال حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

آپ کو بزرگان مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ سے خاص عقیدت اور قلبی نسبت تھی۔ حضرتؒ مکان میں

ف آپ سے متعلق تفصیلات کے لئے سالنامۂ اللطیف سنہ ۱۳۸۷ھ ملاحظہ فرمائیے ۱۲

حاضری اپنے لئے باعثِ فخر و شرف سمجھتے تھے۔ کوئی اہم
جلسہ یا تقریب ایسی نہیں ہوتی جس میں آپ شرکت نہ فرماتے
ہوں۔ تادمِ آخر وہی خلوص اور عقیدت رہی۔ یہی وجہ ہے
کہ انتقال سے چند گھنٹے پیشتر ۱۲ جنوری روز دوشنبہ
علالت کے باوجود حضرتؒ مکان تشریف لائے اور اعظیم البرکت
اعلیٰحضرت قبلہ مدظلہ العالی اور حضرت مولانا ابو صالح عماد الدین
سید شاہ محمد ناصر صاحب قبلہ قادری دامت برکاتہ العالی
اور حضرت مولانا ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر
صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی ناظم دارالعلوم لطیفیہ مکان
حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ کی ملاقات سے مشرف ہوکر
سب سے وداعی سلام عرض کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

آپ نے ۱۳ جنوری ۱۹۷۰ء شب سہ شنبہ کے
آخری پہر اس دنیائے فانی پہ آخری نظر ڈالتے ہوئے
داعئ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جناب الحاج مولانا زکی الدین احمد صاحب آپ کے
انتقال کی خبر حضرتؒ مکان کو بذریعۂ ٹیلیفون دیتے ہوئے
گذارش کی کہ عزت مآب اعلیٰحضرت قبلہ مدظلہ العالی نمازِ
جنازہ پڑھائیں۔

مخدومنا عالیجناب مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ
محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین مکان
حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہٗ آپ کے برادرِ عزیز نیز اساتذۂ
دارالعلوم لطیفیہ نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ تمام
اہلِ شہر و بیرونِ شہر اور مختلف مقامات کے سینکڑوں
احباب جمع تھے۔ بعد نمازِ عصر شہر کی عیدگاہ میں
عزت مآب اعلیٰحضرت قبلہ سجادہ نشین مکانِ حضرت قطبؒ
ویلور قدس سرہٗ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ غروبِ آفتاب کے
قریب حکیم صاحب کو آغوشِ لحد میں دے دیا۔

اس طرح یہ علم و حکمت کا شمس باری غروبِ آفتاب سے
قبل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ دعا ہے کہ خالقِ بزرگ
و برتر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں حکیم صاحب
مرحوم کو اپنی آغوشِ رحمت میں لیتے ہوئے جنت الفردوس
کے اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔

حکیم صاحب موصوف کے فرزند بلند اقبال جناب
مولوی الحاج حکیم زکی الدین احمد صاحب مالک نظامیہ دواخانہ
قابل باپ کے لائق فرزند الولد سر لابیہ کے آئینہ
دار ہیں۔ آپ نے درس نظامیہ سے فراغت کے بعد
طبیہ کالج کرنول آندھرا پردیش سے فن طبابت میں تکمیل
فرمائی اور اپنے والد ماجد کے ساتھ رہ کر اس میں مہارتِ
تامہ حاصل کی ہے۔

خدائے تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقی اور
دستِ شفا میں برکت عطا فرمائے۔

آمین بجاہِ سید المرسلین صلعم۔

تندرستی کے اصول

جہاں "اللطیف" روحانی صحت و غذا کے سامان فراہم کرتا ہے وہیں جسمانی صحت و غذا کے لئے بھی کچھ نہ کچھ اسباب ناظرین کے لئے فائدہ سے خالی نہ رہیں گے۔ اسی لئے جناب اسد ملتانی کی ایک نظم جو تندرستی کے اصول سے بھرپور ہدیۂ ناظرین رسالہ ہے۔

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہئے بچنا غذا سے

اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی
تو استعمال کر انڈے کی زردی

جو ہو محسوس معدے میں گرانی
تو چکھ لے سونف یا ادرک کا پانی

اگر خوں کم، بنے بلغم زیادہ
تو کھا گاجر، چنے، شلغم زیادہ

جگر کے بل پہ ہے انسان جیتا
اگر ضعفِ جگر ہے کھا پپیتا

جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا
اگر آنتوں میں خشکی ہو تو گھی کھا

تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے

جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو مصری کی ڈلی ملتان کی چوس

زیادہ گر دماغی ہے ترا کام
تو کھا تو شہد کے ہمراہ بادام

اگر ہو قلب کی گرمی کا احساس
مربہ آملہ کھا اور انناس

جو دکھتا ہو گلا نزلے سے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

اگر ہے درد سے دانتوں کے بیکل
تو انگلی سے مسوڑوں پر نمک مل

جو بدہضمی میں تو چاہے افاقہ
تو دو اک وقت کا کر لے تو فاقہ

از
جناب افضل العلماء
الحاج مولانا محمد یوسف صاحب کوکن
یم ۔ اے ۔ یم ۔ رلٹ
صدر شعبۂ عربی، فارسی اردو (مدراس یونیورسٹی)

یہ سب جانتے ہیں کہ کرناٹک میں مدوراکے بعد ایک مستقل اسلامی ریاست نواب سعادت اللہ خان نے بنائی۔ یہ بیجاپور کے مشہور نوائط خاندان کے ایک فرد تھے۔ عالمگیر کے آخری دورِ حکومت میں نواب ذوالفقار نصرت جنگ نے قلعہ جینجی ضلع جنوبی آرکاٹ اور اس کے اطراف واکناف پر کئی حملے کئے مگر قلعہ جینجی فتح نہ ہوسکا۔ عالمگیر کی وفات کے سات سال بعد نواب سعادت اللہ خان نے ۱۱۲۵ھ میں قلعہ جینجی فتح کیا۔ ان کے بڑے بھائی نواب غلام علیخان نے بڑی بامعنی تاریخ نکالی یعنی ؎

کرد اسلام کفر را بیرون

اسی زمانہ سے اسلام کی شان وشوکت دیارِ کرناٹک میں روشن اور نمایاں ہونے لگی۔ بیجاپور کے بیسیوں خاندان ہجرت کرکے آرکاٹ، ویلور، کاویری پاک آمبور، وانمباڑی، ترپتور، پیارم پیٹ، سات گڑھ۔ اور ادھر لولور، ترنامل۔ چیت پیٹ، نصرت گڈھ اور جینجی، فتح پیٹ، الگنا نور، انند ورم اور نطہر نگر میں آباد ہوئے۔ مگر علمی حیثیت سے آرکاٹ اور ویلور کو جو نمایاں حیثیت حاصل ہوی وہ کرناٹک کے کسی اور قصبے یا گاؤں کو حاصل نہ ہوسکی۔ مولانا محمد حسین بیجاپوری اور مولانا فخر الدین مہکری نائطی وغیرہ جیسے اہل علم وکمال آرکاٹ پہنچ چکے تھے۔ اور شائقین علم وادب کو اپنے سرچشمۂ فیض ظاہری وباطنی سے سیراب کررہے تھے۔

سنہ ۱۱۲۵ھ میں جیساکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے مستقل اسلامی ریاست قائم ہوی تھی۔ سات سال بعد حضرت سید شاہ عبد اللطیف قادری نقوی بیجاپوری، ویلور پہنچے اور اپنی مسندِ درس بچھائی۔ وہ

اہلِ علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ریاضت بھی تھے۔ باطنی کمالات خاندانی ورثہ میں ملے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت رکن الدین محمد سید شاہ ابوالحسن قربی قادری جیسا صاحب کمال دانشور اور صوفی عطا کیا تھا جن کی بدولت لوگوں کے دلوں میں دینی اور علمی جوش وولولہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ فارسی سرکاری اور علمی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی حد تک مادری زبان کی بھی حیثیت رکھتی تھی۔ لوگ اس میں گفتگو اور بحث کرنے کو قابلِ فخر سمجھتے تھے۔ دکھنی زبان بھی تھی جو عام بول چال میں استعمال کیجاتی تھی۔ تفسیر و حدیث و فقہ و اصولِ عقائد و کلام و فلسفہ و منطق کی متداول کتابیں پڑھی اور پڑھائی جارہی تھیں۔ عربی ادب کی کتابوں میں سبعہ معلقات، مقاماتِ حریری، مقامات بدیع الزمان ہمدانی، حماسہ ابوتمام دیوان متنبی معروف کتابیں تھیں جن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہورہی تھی۔ آگاہؒ کے سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو دفاتر اشعار کے ساتھ ساتھ فیروز آبادی کی قاموس کو بھی حفظ کرلینا چاہتے تھے۔ اس زمانہ میں تعلیم کا انداز بالکل الگ تھا۔ آج کل کی طرح صبح دس بجے جانا اور پھر چار پانچ بجے گھر لوٹ جانا نہیں ہوتا تھا۔ تحصیل علم سے گریز کی کوئی شکل نہیں ہوتی تھی۔ استاد طالب علم کو مختلف طریقوں سے جانچتا تھا کہ اس میں محنت کرنے کا کتنا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ طالب علم کو اپنی سواری سے ساتھ پیدل چلاتا تھا اور درس بھی دیتا جاتا تھا۔ اس سے کام بھی لیتا اور اس کو پڑھاتا بھی تھا۔ اس سے مذاق ہوتا بھی تو اس میں ادب کے لطیف نکتے بھی ہوتے تھے۔ عربی اور فارسی کی ضخیم کتابیں رات دن کی مسلسل بحثوں کے ساتھ ختم کی جاتی تھیں۔ صبح وشام اور دن اور رات کی صحبت اور ہم نشینی سے طالب علم کے دل و دماغ میں اتنی جلا پیدا ہو جاتی تھی کہ مختلف علوم وفنون کے اعلیٰ نکات وہ خود ہی حل کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔

حضرت **قربی** علیہ الرحمہ اسی طرز تعلیم کے فیض یافتہ تھے۔ عربی اور فارسی کے بہت اچھے ادیب تھے۔ فارسی شاعری اور اس کے محاوروں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ مسلماتِ شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کا بڑا ملکہ تھا۔ ان کے پاس پڑھنے والوں کو بڑی دلی مسرت ہوتی تھی اور ایک طرح کا غیر معمولی انبساط ہوجاتا تھا۔ اور جب کسی کو اس کا موقعہ نہیں ملتا تو طلبہ کو دلی رنج ہوتا تھا۔ مولانا باقر آگاہ ویلوری ان سے پڑھنا چاہتے تھے۔ اپنے چچا مولوی محمد حبیب اللہ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے حضرت قربیؒ سے گفتگو کی۔ حضرت قربی نے فرمایا ’مدت سے میں نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ میرے پاس کچھ دن شرف نامہ پڑھ لے تو شاید اچھی قابلیت پیدا ہوجائے۔ ان کا طریقۂ تدریس بہت دل نشین ہوتا تھا۔ ایک دو سبق ہی پڑھے تھے کہ قربی کو آرکاٹ سے ویلور چلا جانا پڑا۔ مولوی حبیب اللہ نے اپنے بھتیجے سے کہا مجھ سے سبق لے لیا کرو۔ لیکن حضرت قربی کی وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی تھی۔ آگاہ اپنے چچا کے سامنے سبق لینے بیٹھے تو

تو ان کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے اور زار و قطار رونا شروع کیا۔ پھر بعد میں ان کے ساتھ ایک سال رہنے کا موقعہ ملا تو ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ جس کا انہوں نے اپنی ہر ایک کتاب میں اعتراف کیا ہے۔

حضرت قربیؔ کے صاحبزادے حضرت محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقیؔ نے ایک مدت تک کچھ نہیں پڑھا تھا، انہوں نے خواب دیکھا کہ حضرت نظامی گنجوی تشریف رکھتے ہیں۔ وہ ان سے شرفنامے کے بعض نکات حل کرنا چاہتے تھے کہ ان کی آنکھ کھل گئی۔ ذوقیؔ نے اپنے والدِ ماجد کے سامنے اس خواب کا ذکر کیا۔ قربیؔ نے فرمایا شرفنامہ لے آؤ۔ اور مجھ سے پڑھنا شروع کرو۔ چند ہی اسباق ہوے تھے کہ ایسا معلوم ہُوا کہ ان کے دل و دماغ کی ساری راہیں کھل چکی ہیں۔ خیالات و تصورات کا اتنا وفور ہُوا کہ بعد میں وہ ایک زبردست ادیب اور شاعر ہُوے، کئی عمدہ مثنویاں لکھ ڈالیں۔

حضرت قربیؔ اور حضرت ذوقیؔ کی زندگی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کوئی وقت بیکار نہیں گزر رہا تھا۔ کبھی فقہی موشگافیوں پر تبصرہ ہو رہا ہے تو کبھی صوفیانہ نکات و مسائل پر بحث ہو رہی ہے کبھی کلام و عقائد کے اختلافی اور نزاعی مسائل پر عالمانہ تنقید ہو رہی ہے تو کبھی فارسی محاورات و اصطلاحات کی تشریح کی جا رہی ہے۔ اور بیسیوں اشعار بطور استدلال پیش کئے جا رہے ہیں۔ عینیت و غیریت کے مسئلے چھڑے ہوے ہیں۔ ان سب پر عالمانہ بحث ہو رہی ہے۔ عام اور خاص لوگ آتے ہیں اور ان سے فتوے اور سوالات پوچھ رہے ہیں۔ ہر ایک کو تشفی بخش جواب دیا جا رہا ہے۔ حضرت ذوقیؔ نے خطوط کی شکل میں مختلف لوگوں کو جو جواب عقائد کے متعلق دیا ہے وہ انشاے عقائد ذوقی کے نام سے مدوّن ہو چکا ہے۔ اس فضا اور ماحول کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک عامی بھی فقیہ اور متکلم نظر آنے لگا تھا۔

حضرت قطبِ ویلور قدس سرہٗ کے فرزندِ دلبند حضرت رکن الدین سید شاہ محمد قادری قدس سرہٗ نے دارالعلوم لطیفیہ کی سنہ ۱۳۰۲ ہجری میں تعمیر و تشکیل نو کی تھی، اس سے پہلے یہاں حضرت قربیؔ اور حضرت ذوقیؔ خود اپنی جگہ پر ایک بڑی درسگاہ بنے تھے۔ ۱۱۷۹ھ میں حضرت مکان کے اندر ایک خانقاہ قائم ہوئی تھی اور ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی۔

دیارِ کرناٹک میں جتنے بھی علماء و فضلا پائے جاتے ہیں وہ سب اسی خانقاہ و دارالعلوم کے فیض یافتہ ہیں۔ ان حضرات کی صحبتوں میں بیٹھنے کے بعد انہی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ خوش خلقی و خوش طبعی اور انکسار و تواضع ان کے نمایاں اوصاف ہوتے تھے۔

آگے چل کر حضرت قربیؔ و حضرت ذوقیؔ قدس سرہما کے شاگردوں نے اپنی اپنی جگہ مسند درس بچھائی اور بہت سوں کی تربیت کی۔ مولانا باقر آگاہ حضرت قربیؒ کے شاگرد تھے۔ آگاہ کے دامن تربیت میں بہت سے اہل علم

وقلم پیدا ہوئے جنہوں نے علم و ادب اور دین کی نمایاں
خدمتیں انجام دیں۔

مولوی غلام اعز الدین خان بہادر مستقیم جنگ
نامی۔ مولوی غلام محی الدین معجز۔ مولوی علی موسیٰ رضا راقی
آگاہ کے نمایاں شاگردوں میں گنے جاتے ہیں۔ حضرت
ذوقی کے ایک مشہور شاگرد حضرت مہاجر تھے۔ جنہوں نے
ذوقی کی مشہور فارسی کتاب معجز مصطفےٰ کا اردو نظم
میں کامیاب ترجمہ کیا اور اس کا نام ریاض السیر رکھا تھا۔

حضرت قربی و ذوقی قدس سرہما کے بعد تیسری
جلیل القدر شخصیت حضرت قطب ویلور کی تھی۔ ان کا
نام نامی محی الدین شاہ عبد اللطیف قادری تھا۔ سنہ ۱۲۰۷ھ
میں ویلور میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۸۹ھ میں مدینہ منورہ
میں وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں جواہر الحقائق
فصل الخطاب بین الخطاء والصواب اور جواہر
السلوک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی بدولت
دیار کرناٹک کے تمام قصبوں اور دیہاتوں میں اسلامی علوم
وفنون کے چرچے ہوئے۔ آپ کے تلامذہ اور مریدین کا حلقہ
بہت وسیع تھا سینکڑوں اہل علم کو آپ سے بیحد فیض پہنچا
ہے۔ مولانا عبد الحی بنگلوری آپ کے ممتاز شاگردوں میں
سے ہیں۔ کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے ایک
دوسرے شاگرد شاہ عبد الغفار مسکین تھے۔ جنہوں نے
کئی صوفیانہ مثنویاں لکھیں اور ایک دیوان بھی یادگار
چھوڑا ہے۔ آپ کی بدولت کئی ایک اہل علم ویلور میں جمع
ہوگئے تھے۔ اور شائقین طلبہ کو درس دے رہے
تھے۔ اس زمانہ میں مدراس کے علاوہ سب سے بڑا علمی
مرکز ویلور تھا لیکن فیوض جاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے
ویلور کو ممتاز فضیلت حاصل تھی۔ انہی کے دامن
تربیت میں پل کر مولوی عبد الوہاب صاحب نے
مدرسہ باقیات صالحات قائم کیا جو اب تک کامیابی
کے ساتھ ساری منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔

انگریزی تعلیم کے فروغ کے بعد یہاں کے علمائے
کرام نے مضبوط بنیادوں پر عربی مدارس کے قائم کرنے
کی ضرورت محسوس کی اور خاص کر اس حالت میں جبکہ
مدرسۂ اعظم مدراس جو ایک عربی مدرسہ تھا انگریزی مدرسہ
میں تبدیل کر دیا گیا۔ مدراس میں مدرسۂ سعیدیہ قائم
ہوا جس نے نہ صرف طلبہ کی تعلیم کا بندوبست کیا
بلکہ گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، کریما، پند نامہ،
تحفۃ العراقین، وغیرہ کی سی تمام درسی کتابیں متعلمین
مدرسہ کے لئے چھپوائیں۔ ۱۲۸۹ کی چھپی ہوئی گلستاں
و بوستاں کے نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس مدرسے
نے ایک مدت تک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔ مگر آگے
چل کر اس کی اعلیٰ حیثیت قائم نہیں رہی۔

۱۳۰۲ھ میں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے دار العلوم
لطیفیہ کی تشکیل نو ہوئی۔ مولانا محمد تقی لکھنوی
مولوی عبد الجمیل صاحب پشاوری اور مولانا احمد حسن صاحب
کانپوری جیسے اساتذہ سے تدریسی خدمات لی گئیں۔

ان کی بدولت ویلور کی علمی رونق دوبالا ہوگئی۔ ہر طرف سے شائقین علم کھینچ کر ادھر چلے آرہے تھے۔ قابل اساتذہ کی تربیت سے ان طلبہ کے اندرونی جوہر کھلنے لگے تعلیم سے زیادہ تربیت کا اثر تھا۔ عامیوں کو فقہی مسائل کا سکھا دینا حلقۂ علمائے ویلور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میرے دادا غلامی صاحب ایک بالکل ان پڑھ کسان تھے۔ آخر عمر میں بڑی مشکلوں سے سورۂ یٰسین یاد کرلی تھی۔ اسی کو دہرا دہرا کر پڑھتے جاتے تھے۔ پارۂ عم کی چند آخری سورتیں یاد کرلی تھیں جن کو وہ پنجگانہ نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ مگر حیرت یہ تھی کہ فقہ وعقائد وکلام کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔ پڑھے لکھے اماموں اور قاریوں کو بھی گرفت کرلیتے تھے۔ یہ صرف حلقۂ علمائے ویلور کا فیض تھا کہ ان کی بدولت ہمارے بہت سے عامی اور جاہل عالم بن گئے تھے۔

فارغین دارالعلوم لطیفیہ کی بڑی لمبی فہرست ہے ان کے متعلق یہاں تفصیل کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اس درسگاہ سے صرف فقیہہ اور صوفی ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ بہت اچھے ادیب اور شاعر بھی بنے، جنہوں نے فارسی اور اردو شاعری کو بہت زیادہ فروغ دیا۔ ہر جمعرات کو مدرسہ کی انجمن میں طلبہ کے سامنے تقریریں کرنے کے بعد آپس میں بیت بازی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو گھنٹوں جاری رہتا تھا۔ بیت بازی کے جوش میں سینکڑوں فارسی اور اردو کے اشعار یاد کرلیا کرتے تھے اور اس طرح ان کا فارسی اور اردو ادب پختہ ہوجاتا تھا۔ میرے ماموں حضرت مولانا **ابوصالح محمد غضنفر حسین شاکر نائطی** رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق ادب اسی بیت بازی اور پرلطف ادبی نشستوں کی وجہ سے پختہ ہوا تھا۔ ادھر مولانا ضیاء الدین احمد **امانی** مرحوم تھے جنہوں نے فارسی اور اردو کو بہت فروغ دیا۔ امانی بھی لطیفیہ کے پڑھے ہوئے تھے اور باقیات میں بھی تعلیم حاصل کی۔ آج جامعہ دارالسلام عمرآباد کے طلبہ میں ادب اردو کا جو پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق پایا جاتا ہے وہ سب حضرت شاکر نائطی رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ہے۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ دوسرے مدارس کی خدمات کا اعتراف نہ کریں۔ ہر ایک نے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ مدرسہ فیض عام۔ اور مدرسہ معدن العلوم وانمباڑی نے ایک مدت تک بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ مگر اب انگریزی تعلیم کی وجہ سے اس کا قدیم وقار قائم نہیں رہا۔ مدراس میں ۱۳۰۹ھ میں مدرسہ محمدی قائم ہوا تھا جہاں سے بیسیوں صاحب طرز وفکر بن کر نکلے۔ مگر یہ بھی تعطل کا شکار ہوگیا۔ مدرسہ سعیدیہ کو قدامت حاصل تھی مگر اب کچھ باقی نہ رہا۔ مدرسہ دارالسلام ۱۹۲۴ء میں قائم ہوا جو اپنی خدمات انجام دیتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پہلے استاد حضرت مولانا شاکر نائطی تھے جو دارالعلوم لطیفیہ کے فارغ تھے۔

دیار کرناٹک میں دارالعلوم لطیفیہ

بھی ایک مدرسہ ہے جو تقریباً ۱۱۳۴ ھجری سے اپنی علمی خدمات انجام دیتا جارہا ہے۔ اور اب بھی اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین اور آپ کے عزیز برادران جناب ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر صاحب قبلہ قادری۔ جناب ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری کی سرپرستی میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا جارہا ہے

کرناٹک کے قدیم علماء پہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی اکثریت لطیفیہ ہی کے فارغین ہیں۔

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش اور ادھر ممبئی میسور لو ملیبار کے علاقوں میں بھی لطیفیہ کے فارغین کا اثر نظر آئے گا۔ اور یہ علاقے اب بھی اس سے فیض اٹھاتے جارہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ مدرسہ پورے آب و تاب کے ساتھ دین کی خدمت انجام دیتے ہوئے ارتقا کی منزلیں طے کرتا جائے گا۔

حضرت داغِ دہلوی

از حافظ سید محمد اللہ بختیاری ضیاء لطیفی
لطیفیہ عربی کالج حضرت مکان ویلور۔

شعر و شاعری کا مقام ادبی دنیا میں بہت بلند ہے اس کا اندازہ کرنا اور جائزہ لینا کہ کس شاعر نے فن شعر گوئی میں کیا مقام حاصل کیا۔ اس کی قابلیت کے رموز کیا ہیں، ادبی اعتبار اور شاعرانہ وقار سے کس نے اردو ادب کو مالا مال کیا، ناممکن تو نہیں دشوار ضرور ہے کیونکہ ہر شاعر نے اپنے فطری جذبات و احساسات کے مطابق طبع آزمائی کی ہے، کسی نے قصیدہ گوئی میں کمال حاصل کیا تو کسی نے مرثیہ گوئی میں انتہا کردی۔ اسی طرح کسی نے نعت گوئی میں آسمان سے تارے توڑ لائے تو کوئی میدان غزل میں شہ سوار بنکر آیا۔ حضرت داغ نے بھی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

آپ کی شاعری کا آغاز ۱۸۴۲ء سے ہوا جبکہ آپ کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ قلعۂ معلیٰ میں پہنچنے سے پہلے ہی شعر کہنے لگے تھے ۱۸۴۴ء میں قلعۂ معلیٰ پہنچے اور پہنچتے ہی بلند پایہ استاد محمد ابراہیم ذوق کی تلمذی اختیار کی۔ ذوق کی وفات ۱۸۵۴ء میں ہوئی اس وقت تک آپ نے ان سے پورا استفادہ کیا۔ اس دس سالہ عرصۂ شاگردی میں نہ صرف داغ نے اپنے آپ کو تیار کرنے کی بے انتہا کوشش کی۔ بلکہ حضرت ذوق نے بھی شاگرد کو ہونہار اور محنتی پاکر بڑی جاں سوزی اور محنت سے تیار کیا۔ ذوق اپنے ساتھ ہر مشاعرے میں داغ کو لے جاتے تھے اور جن مشاعروں میں شاہ ابوظفر کی غزل جاتی تھی تو اسے ذوق ہی سناتے تھے اور اپنی غزل داغ سے پڑھایا کرتے تھے۔ قلعۂ معلیٰ میں سوائے شاعری کے کوئی اور کام نہ تھا۔ اس لئے داغ نے اس دس سالہ مدت میں اتنی ترقی کر لی کہ اور شعراء تیس سال میں بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسی سبب سے ذوق کے انتقال کے بعد داغ نے غالب کی شاگردی اختیار نہیں کی، مگر غالب خود داغ کے مداح و معترف تھے۔ داغ کو اپنے پاس بلاتے اور اپنی غزلوں پہ غزلیں کہلواتے اور سن کر خوب داد دیتے تھے۔ حضرت داغ کا قلعہ میں آنا' اور بلند پایہ شاعر ذوق سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا' یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ قلعۂ معلیٰ میں پہنچنے کے بعد داغ کی تعلیم باقاعدہ شروع ہوگئی۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ خوش نویسی، نشانہ اندازی' اور بہت سے فنون سیکھے مصطفٰے خاں شیفتہ کے مشاعرے میں پہلے پہل داغ نے شرکت کی اور اپنی غزل سنائی۔ اسی غزل کا یہ مطلع ہے۔ اس مطلع میں دلِ بیتاب کی چار تشبیہیں ایک جگہ جمع کردی گئی ہیں۔ کتنا خوب ہے ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں

کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

اس شعر کو سن کر دہلی والوں کی آنکھیں کھل گئیں اور داغ کا نام ہر ایک کی زبان پہ رہنے لگا۔ اس کے بعد سے داغ ہر مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ دہلی کی زبان نہایت معتبر اور نہایت مستند اور ٹکسالی تسلیم کی گئی۔ انہیں بھی اپنی اس امتیازی خصوصیت پر ناز تھا۔ دیکھیئے یہ شعر انہوں نے کس دعوے سے کہا ہے ؎

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

جب انہیں بحیثیت شاعر بادشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر اٹھارہ سال سے کچھ زائد تھی قلعہ معلیٰ کے شاہی مشاعروں میں خاص خاص شعراء ہی شامل ہوسکتے تھے عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں خاص مشاعروں میں ایک مشاعرہ تھا جس کا طرحی مصرع یہ تھا

ع "کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے"

جب اساتذہ پڑھ چکے تو داغ کو بھی حضور میں پیش کیا گیا۔ تعارف ہو چکا تو انہوں نے طرحی زمین میں اپنی غزل سنائی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہوے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر تمام اہل دربار جھوم اٹھے۔ شاہ ظفر نے بھی خوب داد دی۔

اگرچہ وہ بہت زندہ دل شگفتہ مزاج بذلہ سنج و شوخ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان کے ایوان شخصیت کا سب سے بڑا ستون ان کی زندگی بخش شاعری ہے یا پھر ان کی ڈھلی ہوی بے تکلف ٹکسالی زبان میں ان کا تغزل یا معاملہ بندی۔

آپ کے کلام کا بہت سا حصہ سہل الحصول ہے، زبان کی بے تکلفی اور بیان کی صفائی کے لئے یہ ایک مطلع بطور مثال کافی ہوگا۔ ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

غدر کے مصائب اور دلی کی تباہی سے بیزار ہوکر بادل نخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں جو غزل کہی ہے اس کا ایک ایک شعر ان کے مجروح احساسات کا ترجمان ہے یہ مطلع اسی غزل کا ہے۔ ؎

یوں مٹا جیسے کہ دلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں، نام و نشانِ دہلی

اسی پر آشوب زمانے میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام تلف ہوگیا۔ دہلی سے نکلے تو آنولہ ضلع بریلی کے ایک رئیس کے ہاں دو سال قیام پذیر رہے۔ انہوں نے داغ کی اتنی خاطر و مدارات کی کہ آلام و افکار بہت حد تک دور ہو گئے۔ انہیں کی وساطت سے رامپور پہنچے۔ اور نواب یوسف علی خاں کی ادب نوازی و شرفا پروری سے مستفید ہو کر فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے۔ رامپور ان دنوں دلی و لکھنو کے شعراء کا سنگم بنا ہوا تھا۔ دن رات شعر و شاعری

کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اسیر۔ امیر مینائی۔ جلال لکھنوی خواجہ خلق تسلیم لکھنوی۔ منیر شکوہ آبادی، یہ سب مشاہیر رامپور میں جمع تھے۔ داغ نے آکر اس شگفتہ گلزار کو اور بھی پر بہار بنا دیا۔ اور وہ یہاں خوب چمکے، نواب کلب علیخاں کے عہد میں رامپور کی ادبی شان دوبالا ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ حضرت داغ کی شاعری بلندی پر پہنچ گئی۔ غزل تو ان کا خاص میدان تھا۔ باقی اصناف سخن پر بھی حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔

قصائد میں بھی زبان کا وہی رنگ ہے جو ان کا غزل میں ہے۔ دہلی کی تباہی پر جو شہر آشوب لکھا ہے اسے پڑھکر یہی کہنا پڑتا ہے " کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر"۔ قوتِ بیان کا جو اظہار اس مسدس میں پایا جاتا ہے اسے دیکھ کر یہ ماننا پڑیگا کہ اگر وہ غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوتے تو اس صنف کو بھی بخوبی ادا کرتے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھی۔ ان کے نام، پتہ اور رجسٹر میں درج ہوتے رہتے تھے۔ ذات پات کی تمیز انہوں نے کبھی گوارا نہ کی۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ہندو شعراء بھی شامل تھے جو صاحب دیوان ہونے کے علاوہ اپنے وقت کے استاد بھی کہلائے۔ مثلاً پروفیسر نارائن پرشاد۔ مہر گوالیاری جن کو نواب سائل نے جانشین داغ کی سند بھی عطا کی تھی۔ بیخود دہلوی۔ رعد گوالیاری راز دہلوی اور بہت سے قابل شعراء کو داغ سے تلمذ

حاصل تھا۔ ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبالؒ بھی انہیں کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ شاگردوں کی اتنی کثیر تعداد ان کی شاعرانہ شخصیت کا روشن ثبوت ہے۔ ان میں بہت سے فارغ الاصلاح تھے اور بہت سے اپنے آپ کو فارغ الاصلاح سمجھ رہے تھے۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ اصلاح کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے تھے۔ دو شاگرد غزل سے اشعار پڑھتے اور آپ اصلاح لکھواتے تھے، جو شعر ناقص ہوتا اسے قلم زد کروا تے اور اس کی اصلاح کرتے۔ ایک دو لفظ ہی کی تبدیلی سے شعر میں روح پھونک دیتے تھے مثلاً جوش ملسیانی کا ایک شعر لیجئے جس کی اصلاح آپ نے فرمائی ؎

حور پر آیا مرا دل نہ پری پر آیا
پر بتوں پر نہیں معلوم کہ کیونکر آیا

مصرع ثانی میں پہلا لفظ بدل کر " ان" رکھ دیا (ان بتوں پر) اس تبدیلی سے ایک تو متروک لفظ خارج ہوگیا۔ دوسرے اس لفظ کی تکرار بھی اس مصرع میں بارگوش تھی، وہ بھی نہ رہی۔ تیسرے یہ کہ اس تبدیلی سے مصرع کی شان ہی کچھ اور ہوگئی۔ اچھے شعر کی داد دینے میں بہت فراغ دل تھے اور اچھا شعر سن کر بے تاب ہو جاتے تھے، مکرر پڑھواتے تھے۔ اگرچہ نو مشق شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی عادت کی ایک حصہ تھی۔ مگر پھر بھی شاگردوں کو یہ تاکید تھی کہ صرف اصلاح شدہ غزل ہی مشاعرے میں پڑھا کریں اور رسالوں میں بھیجا کریں۔ طبیعت بہت انصاف پسند اور منکسر تھی ہمعصروں کا بہ تاؤ بھی آپ کے

ساتھ بہت مخلصانہ تھا اور بہت احترام بھی کرتے تھے
حضرت امیر مینائیؒ کا یہ شعر قابلِ ذکر ہے ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

"آن سے نکلا، شان سے نکلا" اس زمین میں حضرت داغ
کی غزل ہے۔ حضرت امیر مینائیؒ نے اس غزل کی تعریف بھی
بہت زوردار الفاظ میں کی تھی۔ احباب کو اس کا مطلع سنایا
کرتے تھے کہ اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ مطلع یہ ہے:۔

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

آپ کا ایک اور شعر جو تغزل سے بھرپور ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

کسی نے جب یہ شعر مرزا غالب کو سنایا تو وجد میں
آگئے، شطرنج کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے
عالم میں رہے اور پوچھا یہ شعر کس کا ہے؟

رامپور میں بھی ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا
کہ ہر مشاعرے پہ چھا جاتے تھے، حضرت امیر مینائیؒ خود
کہا کرتے تھے کہ غزل پر محنت کرنے سے کیا فائدہ، مشاعرہ
تو داغ کے ہاتھ رہے گا۔ نواب کلب علی خان رامپور نے
بارہا خفیہ طور پر چند آدمیوں کو یہ معلوم کرنے کے لئے مقرر
کیا تھا کہ مشاعرہ ختم ہونے پر جب حاضرین رخصت ہوں
تو ان کی گفتگو کس شاعر سے متعلق ہوتی ہے اور دیکھیں کہ
وہ کس شاعر کے اشعار دہراتے ہیں۔ ان کی رپورٹ
بھی ہمیشہ داغ ہی کے حق میں ہوتی تھی۔ انہیں کے
اشعار کو لوگ گنگنایا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی
ان کے کلام کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ داغ دہلوی
اولیاءِ کرام کو بہت مانتے تھے اور بہت معتقد تھے، دعاؤں
میں وسیلہ ضروری سمجھتے تھے۔ ایک شعر میں صحابہ رسولؐ
اور آلِ رسولؐ کی شان میں اپنی نسبت پیش کرتے ہیں ؎

یہ داغ ہے صحابۂ عظام کا مطیع
یہ داغ جاں نثار ہے آلِ رسول کا

حضرت داغ نے ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۶؍
فروری ۱۹۰۵ء میں دنیا سے کوچ فرمایا۔ انتقال کے
وقت آپ کی عمر ۷۴ سال کی تھی اور آپ کا مزار حیدرآباد
میں درگاہِ یوسفینؒ شریفین کے اندرونِ احاطہ میں
مسجد و حوض کے درمیان واقع ہے۔

حضرت داغ کے چار دیوان ہیں، آفتابِ داغ
مہتابِ داغ۔ گلزارِ داغ۔ یادگارِ داغ۔ ایک
مشہور مثنوی ہے جس کا نام فریادِ داغ ہے۔
مضمون کے اختتام پر حضرت داغ کے یہ اشعار دلچسپی سے خالی
نہ ہونگے ملاحظہ ہوں ؎

داغ کے سب حرف لکھتے ہیں جدا
ٹکڑے کر ڈالے ہیں میرے نام کے

پوچھتا جا مرے مرقد سے گذرنے والے
کیا گذرتی ہے تری جان پہ مرنیوالے

اردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا عذابِ قبر سچ ہے؟

از
محمد اکرم
کتہ کوٹہ
زمرۂ خامسہ متعلم دارالعلوم
لطیفیہ
(مکان حضرت قطب ویلور)

خلّاق عالم نے انسان کو عقل وفہم کی دولت دیکر دنیا میں بھیجا اور اس کو تمام مخلوق میں شرف وامتیاز عطا کیا۔ اسی نعمت کی وجہ سے انسان اپنے سے بڑی اور خوفناک چیزوں کو اپنے تابع اور مطیع کر لیتا ہے، اور بعض اوقات خوفناک حادثات کا شکار بھی ہو جاتا ہے، لیکن دنیا کی زندگی کامیاب بنانے کے لئے اس کو ایک ضابطۂ حیات اور ایک مکمل دستور کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ دنیا ایک حکومت اور سلطنت کا دوسرا نام ہے اور کسی سلطنت کا نظام اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا کوئی لائحۂ عمل نہ ہو۔ جب رعایا اس دستور پہ گامزن ہوتی ہے تو بادشاہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اس کو مزید انعام واکرام سے نوازتا ہے اور جہاں کسی نے اس دستور اور قانون سے روگردانی کی اسکی تنبیہ اور سزا دی جاتی ہے۔ اگر بادشاہ اس قسم کے احکام نافذ نہ کرے اور زمامِ سلطنت کو ڈھیل چھوڑ دے تو نظامِ سلطنت درہم برہم ہو جائے گا۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیغمبر کے ذریعہ ضابطۂ حیات بھیجا اور ان کے فرمان پہ گامزن ہونے والے کیلئے انعام واکرام کا وعدہ فرمایا اور جو شخص احکامِ خداوندی سے روگردانی اختیار کیا تو اس کا حشر اظہر من الشمس ہے۔ چونکہ دنیا دار العمل ہے اور یہ دستور انسان کی پوری زندگی کے لئے ہے اس لئے یہاں اس کے عمل کا فیصلہ ممکن نہیں کیونکہ جزا اور سزا کے درمیان انسان کا عمل رک جاتا ہے۔ اس لئے ایک عالم کی ضرورت درپیش ہوی کہ جہاں انسان کے دنیوی عمل کی سزا وجزا دیجائے اور وہ عالم عالَمِ آخرت ہے جس کی پہلی منزل قبر ہے۔

جب اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کو پیدا فرمایا تو اسی وقت اس نے انسان کے لئے چار مقاموں کا انتخاب فرمایا۔ پہلا مقام یہ دنیائے فانی ہے جس میں انسان اپنی نیکیوں یا بدیوں کی کاشتکاری کرتا ہے۔ دوسرا مقام اس دنیا کو الوداع کہنے کے بعد جہاں انسان کو سپردِ خاک کردیتے ہیں یعنی قبر۔ تیسرا مقام عالمِ برزخ۔ چوتھا مقام قیامت کے فیصلہ کے بعد جنّت یا دوزخ۔

عذابِ قبر احادیث نبوی اور قرآن شریف کے آیات سے ثابت ہوچکا ہے۔ مثلاً سورۂ سجدہ کی ایک آیت ملاحظہ ہو: النار یعرضون علیھا غدوًّا

دِ عشیًّا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب ترجمہ وہ آگ ہے کہ دکھلاتے ہیں ان کو صبح وشام اور جس دن قیامت قائم ہوگئی حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں اور عین المعانی میں فرمایا ہے کہ دوزخ میں ان کا ٹھکانا انہیں دکھلاتے ہیں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ فرعون والوں کے ارواح کالے پرندوں کے اندر ہیں، جو ہر صبح شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ قیامت تک اور جس دن قیامت قائم ہوگی ان کی روحیں بدنوں میں دوبارہ آئیں گی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا، داخل کرو، فرعون والوں کو سخت عذاب میں۔ اس عذاب کی یہ نسبت جس میں پہلے تھے۔

علمائے مفسرین بلکہ اہل سنت والجماعت کے اکثر علماء اس آیت کریمہ سے عذاب قبر کا استدلال کرتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خدا کے دربار میں ملتجی رہتے تھے، کہ خدایا تو مجھے عذاب قبر سے محفوظ رکھ۔ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ارشاد فرماتے تھے کہ تم لوگ عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہو۔ (صحیح بخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری لمحات زندگی میں وحیٔ خفی کے ذریعہ اطلاع پہنچی اور آپ یوں ارشاد فرماتے ہیں، گنہگار کلمہ گو پر بھی عذاب قبر ہوگا اس لئے تم لوگ عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہو۔

ایک اختلاف علماء میں یہ ہے کہ عذاب قبر جسم پر ہوگا یا روح پر، یا روح وجسم دونوں اس میں شامل ہیں۔ فرقۂ کرامیہ اور بعض علماء یوں کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں جو قتل وغارت ہوا اور اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کفار کی لاشوں کے آگے کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا کہ تم لوگوں نے خدا کا سچا وعدہ بھگتا۔ تو آپ کے اس ارشاد گرامی سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے وعدے کے موافق کفار کی لاشوں پر عذاب برس رہا تھا لیکن وہ تمام لاشیں صحابۂ کرام کے آگے موجود تھیں اور کسی میں روح کی علامت موجود نہ تھی۔ اس وجہ سے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مُردوں سے گفتگو فرما رہے ہیں؟ غرضکہ اس سے عذاب قبر ثابت ہو جاتا ہے، لیکن ابن ہزم اور ابن ہبیرہ کا مذہب یہ ہے کہ عذاب قبر جسم اور روح دونوں پر ہوگا۔ صحیح حدیث سے نکیر منکر کے سوال وجواب کے وقت روح کا جسم میں دوبارہ آنا پایا جاتا ہے اور اس وقت کا عذاب حدیث میں جو کچھ مذکور ہے مثلاً قبر کا بھینچنا یا دونوں کانوں کے درمیان فرشتوں کا گرز مارنا، اس سے روح اور جسم دونوں پر عذاب قبر ثابت ہو جاتا ہے۔

لیکن اس جسم کے بگڑ جانے پر جو روایات صحیحہ ابن حبان اور تفسیر ابن حاتم میں مذکور ہیں اس سے یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اچھے لوگوں کے ارواح خوبصورت اور برے لوگوں کے ارواح بدصورت کالے پرندوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔

مفسرین کی جماعت یوں بیان فرماتی ہے کہ قبر سے

مراد وہ گڑھا مراد نہیں جس میں انسان کو دفن کر دیتے ہیں، یہاں تو سارے کا سارا بدن مٹی میں اس طرح مل جاتا ہے جیسے شکر دودھ میں گھل مل جاتی ہے۔ بہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس میں ایک انسان مدفون ہے۔ بلکہ قبر سے مراد عالم برزخ ہے۔ نیک لوگوں کے ارواح علیین اور بُرے لوگوں کے ارواح سجین میں پہنچ جاتی ہیں اور انہیں وہاں یا تو راحت میسر ہوتی ہے یا نہیں تو عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ راحت یا عذاب کا دوسرا نام ہے اور احادیث سے بھی یہی ثابت ہے اور قرآنی آیات سے بھی یہی مطلب ظاہر ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ فرعون اور اسکی قوم جو دریائے نیل میں غرق ہو گئی ان میں کسی کی قبر بھی زمین میں موجود نہیں ہے۔ اور ان پہ عذاب نازل ہو رہا ہے۔ (ابن کثیر او قال غیرہ)

اور احادیث بھی اس بات پہ گواہی دیدی ہیں کہ عذاب قبر سچ ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔

بنت عبدالرحمن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث نقل فرماتی ہیں کہ میت پہ نوحہ خوانی کرنے کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔ جب یہ الفاظ بنت عبدالرحمن کے کانوں سے ٹکرا گئے تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے والد کو اس عذاب سے محفوظ رکھے۔ ممکنات میں سے ہے کہ یہ اپنے والد کے انتقال کے موقعہ پہ روئی ہوں۔
(مشکوٰۃ شریف)

ایکمرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک یہودی پہ ہوا جو قبر پہ بیٹھے ہوئے نوحہ خوانی کر رہا تھا تو آپ اس وقت ارشاد فرمائے کہ وہ لوگ جو میت پہ نوحہ خوانی کرتے ہیں اسکے عوض میت کو قبر میں عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے
(مشکوٰۃ شریف)

قرآن شریف میں مذکور ہے۔

لنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون (ترجمہ) البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے تاکہ وہ لوٹ آئیں۔

اس آیت کریمہ میں عذاب ادنیٰ مراد بعض لوگ دنیا میں درپیش ہونے والا عذاب مراد لیتے ہیں مثلاً قحط سالی وغیرہ لیکن حضرت براء رض۔ حضرت مجاہدؒ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ عذاب ادنیٰ سے عذاب قبر مراد لیتے ہیں۔ قرآنی آیت کے ساتھ یہ واقعہ بھی اس بات پہ دال ہے کہ دنیا کے عذاب سے اور عذاب قبر سے کسی کو مفر نہیں۔

قارون اپنی دولت بجائے خرچ کرنے کے جمع کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے خزانے کی کنجیاں چالیس اونٹوں پر لادی جاتی تھیں اس پہ خدا کا قہر نازل ہوا تو خزانے کے ساتھ وہ بھی زمین میں دھنس گیا۔ کہا جاتا ہے، کہ قارون ہر روز کئی ہزار قدم زمین میں دھنس رہا ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔

بہر حال عالم برزخ کا قیاس دنیا کے امور و مشاہدات پہ کرنا محض جہالت اور گمراہی ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا خداوند قادر مطلق کو اپنے امور سے عاجز جاننا یہ پرلے درجے کی جہالت اور نادانی ہے کیونکہ وہ قادر المطلق ہے جس کو چاہے کسی پہ کشادہ کر دے اور جا ہے لوگوں کی

نظروں سے اسے پوشیدہ رکھے۔ وہ قادر ہے کہ لوگوں کو
ایک چیز تنگ دکھائی دے، حالانکہ وہ بہت کشادہ، بہت
بڑی روشن اور نورانی ہو اور لوگ اس کو دیکھ نہ سکیں۔

بعض عذاب قبر کے منکر ہیں، اپنے قول کی تصدیق
اس طرح کرتے ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے
کو کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے؟ جب زندگی ہی نہیں تو جزا
اور سزا کا ہونا بھی محال ہے لیکن اس کے برعکس وہ لوگ
جو عذاب قبر کے قائل ہیں امام غزالیؒ نے جو تین صورتیں
بیان فرمائی ہیں اس کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ اوّل یہ
کہ جب کوئی انسان بیداری سے نیند کی حالت میں پہنچ جاتا
ہے تو بسا اوقات اس کے خواب میں بچھو اور سانپ آتے ہیں،
اور اپنے زہریلے اعضاء سے تکلیف دینا شروع کر دیتے ہیں،
جب وہ اپنی نیند سے چونک پڑتا ہے تو بس وہی بستر ہے
اور وہی کمرہ، اس کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے۔
نہ وہاں سانپ کا وجود اور نہ بچھو کا وجود پاتا ہے۔ اس کے
لئے تمام اشیاء خیالی اور وہمی معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح
انسان جب ابدی نیند سو جاتا ہے تو اس کو قبر میں اس کے
اعمال کے موافق سزا دیجائے گی اور اس کے تمام اشیاء
بالکل صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ ابدی نیند سویا
ہوا ہے اور تا قیامت زندہ نہ ہوگا۔ لیکن زندہ آدمی ان تمام
اشیاء کو خیالی اور وہمی تصور کرتا ہے کیونکہ ایک زندہ آدمی
وحشیانہ خواب دیکھتا ہے تو اس خوفناک منظر سے گھبرا کر چونک
اٹھتا ہے تو اس کے لئے یہ تمام چیزیں وہمی معلوم ہوتی ہیں
اگر یہ بیداری نہ ہوتی تو کوئی انسان خواب میں درپیش
ہونے والی چیزوں کو خیالی اور وہمی تصور نہیں کرتا،
زندہ لوگوں، مردہ لوگوں کے خواب میں فرق یہی ہے
کہ زندہ لوگ خواب کے دوران بیدار ہو جاتے ہیں،
لیکن اس کے برعکس مردہ لوگوں میں بیداری کی علامت
نہیں اس قسم کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار
و بھید پوشیدہ ہیں۔ اور اہل بصیرت پہ یہ باتیں بالکل
واضح ہیں۔ لہٰذا جن کو اس کے اسرار معلوم نہ ہوں اور
اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو اسے ان کے ظاہری معنی کا انکار نہیں
کرنا چاہیئے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا چاہیئے کیونکہ یہی ایمان
کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ ہم نے کافروں کے
قبروں کو بارہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش بھی قبر
میں پڑی دیکھا لیکن ہم نے یہ چیزیں کبھی نہیں دیکھیں اور خلاف
مشاہدہ چیز کیوں تسلیم کی جا سکتی ہے تو اس کا جواب ایسا
دیا جاتا ہے کہ انسان کے ہر ایسی باتوں کے تصدیق کرنے
میں تین صورتیں ہیں:۔

پہلی صورت جو سب سے زیادہ واضح اور صحیح قابل تسلیم
ہے وہ یہ ہے کہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں۔ بیشک
اس کو سانپ اور اژدھا ڈس رہا ہے لیکن یہ تمہاری
نظر نہیں دیکھ سکتی کیونکہ ملکوتی امور دیکھنے کی ان آنکھوں
میں صلاحیت نہیں اور جو شئی بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے
وہ ملکوتی ہے۔ دیکھیئے صحابہ کرام نزول جبرئیل پہ کس
طرح ایمان رکھتے تھے حالانکہ وہ انہیں نہیں دیکھتے تھے، اور

ان کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیلؑ کو دیکھا کرتے تھے۔ پس اگر کسی کو اس بات پر ایمان نہیں تو ملائکہ اور وحی پر بھی ایمان لانا نہایت مشکل امر ہے۔ لہٰذا پہلے کی تجدید و تصریح ضروری ہے۔ اگر کسی کو ایمان ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شئی امت کو نظر نہ آئے لیکن پیغمبر خدا صلعم کو دکھائی دے، پھر میت کے بابت تسلیم کرنے میں کیوں تردد ہے اور جس طرح فرشتے آدمی اور حیوانات کے مشابہ نہیں، اسی طرح وہ سانپ اور بچھو جو میت کو ڈستے ہیں ہمارے عالم (عنصری) کے سانپ اور بچھوؤں کے مشابہ نہیں بلکہ وہ کسی اور جنس کے ہیں جو کسی قسم کے قوت و ادراک و علم میں آسکتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سونے والے کی حالت تم کو تو یاد ہوگی کہ وہ خواب میں سانپ کو ڈستے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف و ایذا بھی اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح جاگنے والے کو محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تم اس کو چیختے ہوئے اور ماتھے پر پسینہ آتے ہوئے دیکھتے ہو اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں وہی دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر میں اس کو وہیں پڑا ہوا دیکھتے ہو۔ نہ اس کے گرد سانپ نظر آتے ہیں نہ بچھو۔ حالانکہ اس لحاظ سے اس کے پاس سانپ اور بچھو بھی موجود ہیں۔ تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ سب باتیں تمہارے مشاہدہ سے باہر ہیں۔ جب سزا اور عذاب درحصل ڈسنے کی تکلیف سے ہوتا ہے تو پھر خیالی سانپ ہو یا حقیقی سانپ ہونے میں کیا فرق ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ تم خود جانتے ہو کہ سانپ بذاتِ خود کچھ تکلیف و ضرر نہیں پہنچاتا بلکہ جس چیز سے تمہیں درد اور تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کا زہر ہے۔ پھر زہر بھی بذاتِ خود کچھ باعثِ تکلیف نہیں بلکہ اس سے جو اثر حاصل ہوتا ہے درحصل وہی باعثِ تکلیف ہے۔ اگر سوائے زہر کے چاہے کسی اور چیز سے اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور عذاب ہوگا۔ جو اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا لیکن اس عذاب کی تکلیف کو بغیر کسی کی جانب نسبت دئے کہ نہ بیان کر سکو گے جس سے عام طور پر اسی طرح کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال انسان کی زندگی کی ذمیم عادتیں خود اس کی موت کے وقت اس کو ایذا اور الم دینے کے لئے حاضر ہو جاتی ہیں اور ان کا درد والم سانپ کے ڈسنے کے موافق ہوتا ہے، گو وہاں سانپ موجود نہ ہو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو عذابِ قبر سے بچائے اور اس کی کرم و نوازش سے ہم قبر میں آرام و راحت حاصل کریں۔

آمین ثم آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(۱) وَمَلِيحَةٍ شَهِدَتْ لَهَا ضَرَّاتُهَا
وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

حسین عورت وہی ہے جس کی خوبصورتی کی گواہی اس کی سوکنیں دیں اور انسان کی فضیلت وہ ہے جس کی شہادت اس کے دشمن دیں۔

(۲) جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ
وَلَا يُلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

نیزہ کے زخم کے لئے دوا ہے لیکن زبان کے زخم کے لئے کوئی دوا نہیں۔

(۳) عِشْ مُوسِرًا إِنْ شِئْتَ أَوْ مُعْسِرًا
لَا بُدَّ فِي الدُّنْيَا مِنَ الْهَمِّ

چاہے زندگی عیش و عشرت میں بسر کرو یا عسرت میں، دنیا میں آنے کے بعد غم و الم سے ہمکنار ہونا ضروری ہے۔

(۴) إِذَا كَانَتِ الطِّبَاعُ طِبَاعَ سُوءٍ
فَلَا أَدَبٌ يُفِيدُ وَلَا أَدِيبٌ

جب کسی کی سرشت ہی خراب ہو، اس کو نہ کوئی ادب فائدہ دیتا ہے اور نہ ادیب (استاذ)

(۵) لَوْ نَظَرَ النَّاسُ إِلَى عَيْبِهِمْ
مَا عَابَ إِنْسَانٌ عَلَى النَّاسِ

اگر لوگوں کی نظریں اپنے عیوب پر ہوتیں تو کوئی شخص کسی کی عیب جوئی نہ کرتا۔

(۶) إِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِي فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ
وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ

اگر تو نہیں جانتا ہے تو وہ ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو وہ دوگنی مصیبت ہے۔

(۷) إِذَا لَمْ يَجِدْ صَبْرًا لِكِتْمَانِ سِرِّهِ
فَلَيْسَ لَهُ شَيْءٌ سِوَى الْمَوْتِ يَنْفَعُ

اگر کوئی شخص اپنے راز کو چھپانے پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے موت سے بہتر کوئی اور چیز نہیں۔

(۸) وَكُلُّ جِرَاحَةٍ فَلَهَا دَوَاءٌ
وَخُلْقُ السُّوءِ لَيْسَ لَهُ دَوَاءٌ

ہر زخم کے لئے دوا ہے لیکن بدخلقی کے لئے کوئی دوا نہیں۔

(۹) فَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِلْفَتَى
مِنْ عَيْشِهِ عَيْشَ الْبَهِيمَةِ

جس انسان کی زندگی میں انسانیت نہ ہو اس کے لئے موت بہتر ہے۔

(۱۰) إِنْ وَهَبَتْ لِدَنَفِ الْحَزِينِ فِدْيَتَهُ
مِمَّا بِهِ لَا غَرَّتُهُ بِفِدَائِهِ

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

شہر آمبور کی مایۂ ناز شخصیت

از
ادارہ

دنیا میں جو بھی آیا اس کو جانا ضروری ہے
کسی کو دوام و قرار نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی آگے جاتا ہے تو کوئی پیچھے۔ یہ سلسلہ اب سے نہیں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور قیامت تک رہیگا۔ مگر جتنی خوشی کسی کے آنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ غم محبوب شخصیت کے بچھڑ جانے کا ہوتا ہے سال رواں کے اوائل میں آمبور کی مشہور شخصیت کے اچانک انتقال سے ہمیں جو رنج و ملال ہوا بیان سے باہر ہے۔ انکی زندگی کے کچھ حالات و کیفیات دلچسپی و معلومات سے خالی نہیں اسلئے پیش ناظرین ہیں۔

جناب الحاج پیش امام عبد القیوم صاحب

سنہ ۱۹۰۲ء میں اپنے آبائی وطن شہر آمبور میں پیدا ہوئے ایک مشہور تاجر، پُرخلوص دوست اور بہترین ساتھی کی حیثیت سے آپ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ آپ نے اپنی اعلیٰ ذہانت و حکمت عملی سے چمڑے کی تجارت میں خوب ترقی کی، نیز آپ کا مال بیرونی ممالک کو برآمد ہوتا تھا، ایک کامیاب تاجر ہونے کے علاوہ آپ بہت ہی رحمدل مہربان اور فیاض تھے۔ آپکی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ایک ہاتھ سے کسی کو کچھ دیتے تو دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہوتی۔ ہر ایک کی خوشنودی و خاطر داری آپ کا وطیرہ بن چکی تھی۔ اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ کی گفتگو کا انداز بہت ہی سنجیدہ اور پُرلطف ہوا کرتا تھا۔ اپنی لطافت و شیریں کلامی سے ہر ایک کا دل موہ لیتے تھے۔

آپ کی قومی خدمات بھی لائق تعریف ہیں۔ آپ کئی سال تک آمبور مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے ٹرسٹی، اور جنرل سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۹۶۴ء میں تجارتی معلومات کے سلسلہ میں مشرق وسطیٰ، انگلستان، امریکہ، کناڈا کا سفر کیا۔

موصوف متقی و پرہیزگار انسان تھے اور مذہب سے اچھا خاصا لگاؤ تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں حج بیت اللہ شریف اور زیارت گنبد خضرا سے مشرف ہوے۔ علماء، حکماء، اور مشائخین کے ساتھ آپکے روابط گہرے تھے، خصوصاً بزرگان مکان حضرت قطبؒ ویلور قدس سرہ کے ساتھ دلی عقیدت محبت کی کچھ اور ہی بات تھی۔ ان بزرگان کے ساتھ انتہائی ادب و احترام سے ملتے۔ ایکمرتبہ آپ آثار مبارک کی زیارت کے لئے حضرت مکان تشریف لائے اور کسی کتاب کے اقتباس کو سناتے ہوئے فرمایا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جو

صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بادشاہِ وقت تھے
آلِ رسول کی محبت، تعظیم و تکریم کو حضور صلے اللہ علیہ
وسلم کی خوشنودی کا باعث سمجھتے تھے اور آپ نے
انتقال سے پیشتر وصیت فرمائی کہ "تجہیز و تکفین سے
پہلے میرے منہ میں موئے مبارک رکھ دینا تاکہ وہ میری
نجات کا باعث ہو۔"

پیش امام صاحب نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے
اظہار خیال فرمایا کہ اتنے بڑے صحابی اور بادشاہ وقت
کی محبت و عقیدت کا یہ عالم ہو تو پھر اس معاملہ میں ہماری
کیا حقیقت ہے۔

انتقال سے پیشتر آپ نے خواب دیکھا کہ موصوف کے
مرحوم فرزند عبدالمالک بلا رہے ہیں اور حضرت مکان سے
رجوع ہونے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اس خواب کے دوسرے ہی
دن دوپہر میں تین بجے ۲۵ مارچ بروز چہارشنبہ مختصر سی
علالت کے بعد حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال
کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء بروز پنجشنبہ تجہیز و تکفین
عمل میں آئی۔ شہر کی بڑی مسجد میں عالیجناب اعلیحضرت مولانا
مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ
قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین مکان حضرت قطبؒ ویلور قدس
سرہ العزیز نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں حضرت والا کے برادران
عزیز محترمان عالیجناب ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر
صاحب قبلہ مدظلہ العالی و عالیجناب مولانا حضرت ابوالحسن
صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی
ناظم دارالعلوم لطیفیہ، اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ شہر و
بیرون شہر کے علماء، حکماء، رؤسا، تجار اور دیگر سینکڑوں
محبین حضرات نے شرکت کی اور اپنے محبوب دوست کو ان
کے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

پیش امام صاحب مرحوم کے بڑے فرزند جناب پیش امام
نذیر احمد صاحب مدراس میں اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد
ٹکنالوجی میں ڈپلومہ حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھی
گئے تھے، باپ کی زیر تربیت رہ کر تجارت میں اچھا خاصا
ملکہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت آپ کاروبار کے
روح رواں کی حیثیت سے بحسن و خوبی اپنی ذمہ داریوں کو
ادا کر رہے ہیں۔ مرحوم کے دوسرے فرزند پیش امام بشیر احمد
صاحب نے بھی باپ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر تجارت
میں اچھا خاصہ تجربہ حاصل کیا ہے، اپنے برادرِ محترم کے
ساتھ دوش بدوش کاروبار میں مشغول ہیں۔ ان دونوں
لائق فرزندوں میں اپنے والدِ ماجد ہی کے اخلاقِ حمیدہ
اور اوصافِ جمیلہ پائے جاتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ ان دونوں برادران
کی عمر و اقبال اور مال و دولت میں ترقی اور آخرت میں
سرخروئی عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین۔

شیراز کی دو مایۂ ناز ہستیاں

از
مصطفیٰ کمال پاشاہ
شہر میسور کے
زمرۂ ساد متعلم دار العلوم لطیفیہ
بمکان حضرت قطب ویلور

یوں تو خاکِ شیراز پہ کئی سخنہائے آفتاب آئے اور ایک مدت تک ان کا شہرہ پرچم کی طرح افقِ اعلیٰ کی سرحدوں سے ہمکلام رہا لیکن کسی کا ظن نہ تھا کہ ان حدوں سے آگے اور ہستیاں بھی جلوہ گر ہیں جو زمانے کے علامہ بنکر نکلیں گی اور وہ تھے حضرت شیخ مصلح الدین سعدی اور آفتابِ سخن حضرت خواجہ حافظ شیرازی۔ علاوہ ازیں جتنے رونما ہوتے رہے وہ تمام مہ و مہر کے آگے ستاروں کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں کی آمد کا نتیجہ تھا کہ شیراز باغ ارم بن گیا اور جا بجا علمی چشمے پھوٹنے لگے۔

شاعری وہ ہے کہ فطرتاً شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو اور وہ جذبہ اسی جوش و خروش کے ساتھ قائم رہے۔ جس جوش کے ساتھ شاعر کے دل میں موجزن تھا۔

شاعری کی اصل یہ ہے کہ جوں ہی شاعر کے دل میں کوئی خیال پیدا ہو فی البدیہہ اس کا اظہار کر دے اور جو فرحت خود میں محسوس کرتا ہو وہ دوسروں میں بھی دیکھے، اس کے ساتھ ساتھ شاعری میں آزادیِ خیال کا ہونا شاعر کے درجۂ کمال کی دلیل ہے اور یہ ہر ایک کو نصیب نہیں۔ شیخ کی ہی وہ شخصیت ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا۔

حق گوئی اور صاف بیانی میں آپ اپنی مثال رکھتا تھا۔ باوجود کئی درباروں سے تعلق رکھنے کے کسی کو خاطر میں نہیں لایا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ابوبکر سعد زنگی آپ کا خاص ممدوح تھا اور اسی طرح انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا۔ باوجود ان دونوں سے گہرے تعلقات ہونے کے اپنی آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ابوبکر بن سعد نے ہلاکو خان کا کہا مان کر بغداد پہ چڑھائی کے وقت اپنے بیٹے سعد کے ذریعے معاونی فوج بھیجی تاکہ ہلاکو خاں ہلاکت سے نجات پا جائے۔ بالآخر جب بغداد تباہی کا شکار بن گیا تو ابوبکر نے مبارکبادی کے لئے سفارت بھیجی، شیخ کی ذات گوارا نہ کی کہ بغداد کی تباہی اور ادھر خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل پہ صبر کا دامن تھام کر خاموشی اختیار کر لے۔ اُسی وقت مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا جو اس قدر پُر اثر اور معنی خیز تھا کہ لوگوں کے دل دہل گئے اور ایک مایوسی چھا گئی۔ درحقیقت یہ مرثیہ

ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو میں تھا۔ یہ اس وجہ سے کہ اس نے اسلام کا نقصان کیا اور اس کی تباہی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا۔ مدح کے پیرایہ میں اسطرح ہجو کی ؎

خسرو صاحبقراں غوث زماں بوبکر سعد
آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست واوصافش گزیں
مصلحت بود اختیار رای روشن بین او
زیر دستاں را سخن نشاید جز

انکیانوں کی مدح میں بھی شیخ نے متعدد قصیدے لکھے، ہر قصیدے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ دلیری اور آزادی کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے ڈر نہیں سکتا ؎

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو
حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع دربار نیست
از خطا باکش نباشد و ز تتار

پھر فرماتے ہیں ؎

حرامش باد ملک بادشاہی | کہ پیشش مدح گویند از قفا ذام
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکیست سعدی را مسلم

عموماً اکثر شعراء کرام قصائد میں اپنے ممدوح کی تعریف اتنی کر بیٹھتے ہیں کہ گویا مبالغہ کی وہی سب سے آخر منزل ہے جو حقیقت سے اس کو اتنا ہی بعد ہے جتنا کہ شب دیجور کو چودھویں رات سے۔ لیکن شیخ نے یہ کبھی گوارہ نہ کیا کہ اپنے ممدوح کی تعریف میں اتنی مبالغہ آرائی سے کام لیا جائے جو حقیقت سے بالکل بعید ہو۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں ؎

ہزار سال نگویم بقائے عمر تو بود
کہ این مبالغہ دانم زعقل نشماری
ہمیں سعادت توفیق بر مزیدت باد
کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری

شیخ کا کلام ہر سمت فو ... ہونے کا واحد راز یہی ہے کہ آپ اکثر وہی واقعات کی عکاسی اور منظر نگاری کرتے جو روزمرہ نظروں کے سامنے گذرتے۔ یہ آپ کا انتہائی کمال تھا کہ ہر دقیق سے دقیق مضمون کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتے کہ ہر عقل بآسانی اس کا ادراک کر لیتی۔ اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ نے تماشا گاہ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا تھا۔ آپ شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے ..... شوخ طبع تھے گویا آپ اوصاف حسنہ کا مجموعہ تھے۔

ایک مرتبہ آپ کہنہ لباس پہنے ہوئے قاضی کے دربار میں گئے اور ایک اونچے مقام پر نشست کی۔ یہ دیکھ کر قاضی برہم ہو گیا اور غیظ کی نگاہوں سے تاکنے لگا۔ اسی اثنا میں میر دربار جو لوگوں کو مقامات دینے پر مامور تھا آپ کو اپنے مقام سے اونچا دیکھ کر کہا ؎

ندانی کہ برتر مقام تو نیست
فروتر نشیں یا برو یا بایست

یعنی یہ مقام جو آپ تشریف رکھے ہیں یہ آپ کا نہیں ہے

اٹھئے اور نیچے جگہ سنبھالئے۔ یہ سنناہی تھا صف
آخر میں جا بیٹھے اور پھر مسائل فقہ پہ بحث چھڑ جاتی
ہے اور ہر ایک اپنی اپنی بات منوانے کی سعی و کوشش
کرتا ہے مگر ناکامی ہوتی ہے تو اُس وقت حضرت
شیخ یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

بر ہان قوی باید و معنوی
نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

یہ صدا سنناہی تھا کہ سارا مجمع آپ کی طرف
کو دپڑا اور ہر ایک مسئلہ کا حل اور برہان قوی کا متلاشی
تھا۔ شیخ نے اس خوبی کے ساتھ مسئلہ کا حل کیا کہ ہر ایک
اپنا سپر ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود قاضی
دربار مجلس سے اٹھا اور اپنی پگڑی آپکے سر پر رکھدی۔

جس طرح آپ اپنی مثال تھے اسی طرح آپ
کی کتابیں بھی زمانہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ آپکی
شہرہ آفاق کتاب گلستان جسکی سادگی، خوش بیانی
لطافت اور شیرینی ہر زمانہ آج بھی اس کا نغمہ سرا
ہے۔ گلستان اور بوستان ان دونوں کتابوں کو شیخ
کے کلام کا خلاصہ ورلب لباب سمجھنا چاہئے۔ فارسی
میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع
خاص و عام نہیں ہوی۔ ایران، ترکستان، تاتار
افغانستان، اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں
کی تعلیم تقریبًا سات سو برس سے برابر جاری ہے۔
مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے
علماء و مشائخ نے ان کی عزت کی۔ امراُ و سلاطین نے
ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ منشیوں و شاعروں
نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے اپنا سپر ڈالدیا۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن و خوبی، فصاحت و
بلاغت، تہذیب اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں
کے لحاظ سے ایک سے ایک بہتر اور جامع ہے۔ مگر بعض
وجوہات کی بنا گلستان کو بوستان پر ترجیح ہے۔ فارسی
نظم میں تو مثنوی مولانا روم اور شاہنامہ فردوسی کی
شہرت اور مقبولیت شاید بوستان سے زائد ہے۔ مگر
نثر میں گلستان سے زیادہ مقبول نہیں ہوی، اس کی
فصاحت و بلاغت، حسن بیان، لطف ادا بے مثل ہے
اس کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اس کے فقروں کی برجستگی
اس کے الفاظ کی بناوٹ، اور پھر باوجود ان تمام باتوں
کے عبارت میں نہایت سادگی و صفائی اس بات پر دال
ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتد بہ حصہ اس کی
تصنیف و تالیف میں صرف کیا اور پھر اس کی تنقیح و
تہذیب میں اپنے فکر و سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔
چنانچہ دیباچۂ گلستان کے آخر میں انہوں نے صاف
کہا ہے کہ، برخے از عمر گراں مایہ برد، خرج کردم۔

گلستان کے طرز پہ بہت سی کتابیں لکھی گئیں
جن میں سے تین موجود ہیں۔ بہارستان جامی
خارستان خانی۔ پریشان قاآنی۔ ان میں تمام اہل
ذوق نے سب سے بہتر بہارستان کو مانا ہے۔ مگر،

گلستان کے مقابلہ میں یہ کتابیں لائی جائیں تو جس طرح
آفتاب کے مقابلہ میں چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو
جاتی ہے اسی طرح سب کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

خواجہ حافظ صاحب کے متعلق جتنا کچھ بھی کہا جائے
بہت کم اور لب تشنہ ہی رہتے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہے کہ اگر
اس قسم کا کوئی یورپ میں پیدا ہوتا تو نہ جانے اس کی
سوانح عمریاں کتنی لکھی جاتیں اور اس کا شہرہ کتنا ہوتا،
لیکن جو کچھ بھی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اس سے یہی پتہ چلتا
ہے کہ آپ کے دور میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ خود آپ کا
کلام ہی اس کی غمازی کر رہا ہے ؎

غزل گفتی و درسفتی بیا و خوش بخواں حافظ
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

آپ کے کلام میں فطری لگاؤ اور خداداد جوہر بہت
نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جس طرح اردو شاعری میں
غالب کا انداز ہی کچھ اور ہے، اسی طرح فارسی کلام میں
آپ کا انداز سب سے الگ اور جداگانہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ
لوگ آپ کے کلام پر جھوم اٹھتے اور کانوں میں گویا گھنٹیاں
بجنے لگتیں۔ اور سیرگاہوں میں خاص اہتمام کے ساتھ آپ کو
مدعو کیا جاتا۔ لوگوں پر آپ کے کلام کا اس قدر اثر ہوتا کہ مستی
کے عالم میں رقص کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ خود فرماتے ہیں ؎

گر مطرب حریفاں ایں پارسی بخواند
در رقص و حالت آرد پیران پارسا را
بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ
سے کچھ کم اور پیچھے نہیں تھے لیکن ان کا اصل اعجاز غزل
گفتنی ہے۔ یہ مسلم کہ اس عالم بود و باش میں آج تک غزل
گوئی میں کوئی شخص آپ کا ہم پہلو اور ہمسر نہ ہو سکا۔ متوسطین
اور متاخرین باوجودیکہ غزل گوئی میں یکتا زمان اور صاحب
کمال ہونے پر بھی ان کو اس بات کا اعتراف ہے کہ خواجہ
کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ع

چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

آپ رندانہ مضامین جس آزادی، رنگینی اور جوش
کے ساتھ ادا کرتے ہیں، یہ آپ کے انتہائی درجۂ وثاق و
کمال کی بین دلیل ہے۔ فطرتاً آپ شگفتہ مزاج اور
شوخ طبع واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے آپ کے غم و درد
کی چوٹ سے خالی پڑے ہیں۔ کبھی حسرت و یاس پر کچھ
لکھتے ہیں تو محض تقلید کی سی بو نکلتی ہے۔ کبھی غمگین منہ
بنانا چاہتے ہیں تو چہرہ سے بشاشت اور شگفتگی نہیں
جاتی۔ وہ کبھی اس قسم کا عشق نہیں کرتے کہ اپنی زندگی
کسی کے پیچھے تباہ کر دیں یا گلی کوچہ میں پڑے رہے معشوق
کی تعریف جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے۔ یہ اسی
وقت کرتے ہیں جبکہ آپ کا دل اس سے متاثر ہو جائے۔
ورنہ یوں سب کچھ کہنے کو بے جا سمجھتے ہیں فرماتے ہیں ؎

نکتۂ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار
عشوۂ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

بقیہ بر صفحہ ۹۶

از ٹی کے۔ نذیر احمد تونسوی ضلع منگلور
متعلم زمرۂ سابعہ
دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطبؒ ویلور

کسی نے کیا خوب کہا ہے "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔

تندرستی ایک ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ زندگی کا دار و مدار اور صحت کے بقا و دوام کے اسباب اسی پر منحصر ہیں نیز زندگی کی خوش حالی کے لئے صحت کا ہونا لازمی ہے۔ بغیر صحت کے انسان کی زندگی عبث ہے۔ غرض میں اسی کے متعلق چند مفکرین کرام کے زرین تفرقے اور صاحب قلم حضرات کے اقتباسات کو مضمون کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ اُمید کہ ناظرین اللطیف کو اور وہ حضرات جن کی زندگی میں صحت و تندرستی ناپید ہے مشعل راہ ثابت ہو۔

صحت

صحت ہی زندگی کا سرمایہ ہے' باوجود اس حقیقت سے آگاہ اور اس کے فلسفے سے آشنا ہونے کے اکثر لوگ ایسے ملتے ہیں' جو اپنی زندگی کو خوشگوار اور اپنی صحت کو توانا رکھنے سے عموماً تغافل و تساہل سے کام لیتے ہیں۔ بیماری جسمانی تکلیف کے علاوہ کام میں حرج اور روزمرہ اخراجات میں اضافہ اور افزائش کا بڑا سبب ہے۔ ہوا اور سورج کی روشنی ماکولات و مشروبات' دانتوں کی حفاظت طرز نشست و برخاست' لباس و ورزش و نیند وغیرہ کے قواعد و اصول ہر انسان کو معلوم ہونی چاہئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان تندرست رہنا دوسرے تمام علوم و فنون ہونے کے ساتھ زیادہ اہم و ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ہنرمند ہونے کے ساتھ عدم صحت بھی ہے تو اس کی یہ ہنرمندی خود ہی کے لئے نہیں اور دوسروں کے لئے بھی بے سود ہے۔

ورزش کی اہمیت

صحت کے بقا و دوام کے لئے ورزش نہایت ہی ضروری ہے' اس لئے انسان کو ہمیشہ سرگرم رہنا چاہئے۔ اگر جسم تمام اعضاء سے آپ کام نہیں لیتے ہیں' تو جسم در اصل ایک مردے کی طرح ہے۔ اس لئے اگر آپ بہتر صحت کے متمنی ہیں تو چاہئے کہ سیر تفریح اور ورزش کو اپنا معمول بنائیں کیونکہ ورزش کرنے سے انسان کے امراض مادی دفع ہو جاتے ہیں اور حرارت غریزی بڑھاتی ہے۔ مفاصل کو سخت اور فضلہ کو دفع اور مسامات کو فراخ کرتی ہے۔ چونکہ ورزش کرتے وقت سانس تیز اور لمبی ہو جاتی ہے تو اس سے پھیپھڑوں میں ہوا زیادہ تیز مقدار میں پہنچتی ہے اور خون زیادہ سرخ اور صاف ہو جاتا ہے۔ اس لئے ٹہلنا اور چہل قدمی کرنا زندگی کے لئے ایک لازم شئی ہے۔

ورزش یا ریاضت کمزوری کا زبردست و بہترین علاج ہے۔ نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور

کرتی ہے بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہے جس
سے وزنی طاقت اور صاف خون بڑھ جاتا ہے، خصوصًا
وہ مسامات اور رونگٹوں کو طاقت بخشتی ہے جسکی وجہ سے
ذہن ہمیشہ صاف ستھرا اور بدن میں چستی و بیداری عقل
میں دوبالگی اور دلی پریشانیوں کا بہترین تریاق ہے۔
اگر کوئی شخص صحت کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو اس
کے لئے ورزش جادۂ حیات ہے۔ مگر یہ کہ اس کے طریقوں
کے ساتھ کریں، مثلاً مقوی انسان کو مکدر یا لیزم لانا، یا
ڈنڈ مارنا وغیرہ اسی طرح تیرنا وغیرہ بھی خصوصًا گرمیوں کے
زمانے میں، یہ ایک نہایت ہی موزوں اور دلپسند ریاضت
ہے اس لئے کہ اس سے سینہ کشادہ اور باڈی کی طاقت
میں اضافہ ہوتا ہے اور جسمانی درد و تکلیف فوت ہوجاتے
ہیں۔ مگر یہ بات قابل یادداشت ہے کہ فورًا ریاضت
کے بعد سرد پانی کا استعمال نہ کریں اور اسی طرح چائے
تمباکو وغیرہ کا استعمال بھی صحت کے لئے مضر ثابت
ہوتا ہے البتہ پسینہ ہی کی حالت میں حلوا۔ دودھ، شہد
یا کوئی مربّہ کھائیں تاکہ جسمانی قوت میں اور اضافہ ہوجائے۔
علاوہ اس کے معمولی سی ورزش اس طرح بھی کی جاسکتی ہے
کہ روزانہ صبح و شام باغ اور میدان یا ساحل و دیگر پُرفضا
و دلکش مقامات کی سیر و تفریح کریں کیونکہ چہل قدمی کرنے
سے ہی تازہ ہوا پھیپھڑوں تک پہنچ سکتی ہے جس سے
دماغ، ذہن اور دل کی تفریح ہوجاتی ہے۔ اور انسان
فکر و خیال کی پریشانیوں سے ہٹ کر ذہنی سکون و آرام
حاصل کرلیتا ہے۔ اسی طرح قیلولہ کرنا بھی انسان کے لئے
صحت کی علامت ہے، خصوصًا اس طریقے سے کہ کھانا کھانے
کے بعد اوّل چت لیٹ کر آٹھ دم لیں، دوّم دائیں طرف لیٹ
کر سولہ دم لیں۔ سوّم بائیں طرف لیٹ کر بتیس دم لیں، تو
اس سے ہضم طعام بہت جلد ہوگا۔

صحت کیلئے فولاد کی اہمیت

صحت کی بقا کے لئے خون
میں فولاد کا ہونا لازمی
ہے۔ کیونکہ فولاد خون کو بڑھاتا ہے اور جگر کو تقویت
دیتا ہے۔ خون میں فولاد کی کمی جب ہوتی ہے تو خلیات
میں آکسیجن نہیں پہنچ سکتا اس سے خون کی کمی کی شکایت
پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے اعضا میں کمزوری اور ضعف
کی شکایت جنم لیتی ہے۔ جسم میں قوتِ برداشت باقی نہیں
رہتی اور رنگ اُڑ جاتا ہے۔ غذا میں جس مقدار میں
فولاد ہو وہ سارا ہی خون میں نہیں مل جاتا بلکہ اس کا صرف
آدھا حصّہ ہاضمہ کے دوران ہضم ہوجاتا اور خون میں شامل
ہوجاتا ہے۔ اگر خون اور ہڈیوں میں فولاد کی طاقت نہ پہنچی
تو باوجود غذا میں فولاد کی طاقت کافی مقدار ہونے کے
خون کی کمی کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ کلیجہ میں خصوصًا
دوسرے اعضاؤں سے زیادہ تر کافی مقدار میں فولاد
ہی ہوتا ہے جسکی وجہ سے خون میں سُرخ ذرّے پیدا کرنے
کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے میانہ قد والوں
میں بقدر الی گرام فولاد کی ضرورت ہے۔

صحت کیلئے ہوا کی ضرورت

تناول طعام

اور آبنوشی کے بغیر انسان کچھ دن تک بقید حیات رہ سکتا ہے مگر ہوا کے بغیر کچھ لمحے بھی نہیں رہ سکتا، اس لئے کہ زندگی ہوا سے ہے اور ہوا صحت کی علامت ہے۔ انسان زندہ اور صحت مند رہنے کے لئے اپنے پھیپڑوں میں صاف اور تازہ ہوا لینا چاہیئے۔ خصوصاً سیر و تفریح سے تھوڑی تھوڑی کرکے تیزی کے ساتھ۔ خدا نے تازہ ہوا، روشنی غذا اور پانی، پرہیز و احتیاط کو ہماری زندگی کا کفیل بنایا ہے، یہ سب ہماری صحت و زندگی کے ضامن ہیں۔ بلاشبہ زندہ رہنے کے لئے ان میں سے ہوا زیادہ اہم اور لازمی شئے ہے۔ چاہیئے کہ انسان کو ہمیشہ صاف ہوا لے۔ کیونکہ تازہ اور صاف ہوا صحت کے لئے بیحد ضروری ہے، جو بیمار ہوتے ہیں ان کے لئے تازہ ہوا ہی باعث شفا اور قدرتی علاج ہے اور انسان صحتمند رہنا چاہے تو سادہ زندگی گذارے اور سادہ غذائیں کھائیں، مثلاً روٹی چاول، گوشت، مچھلی، انڈا وغیرہ ساتھ ساتھ پھلوں کا استعمال بھی کرنا چاہیئے۔ مثلاً گاجر، مولی، ٹماٹر، شلغم سیب، انار، انگور وغیرہ جو جسمانی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کھانا کھانے کے بعد ہی فوراً چائے کا استعمال نہ کریں اور نہ ہی پانی کا۔ بلکہ کھانے کے فراغت سے کچھ دیر بعد پئیں کیونکہ اس سے صحت برقرار رہتی ہے۔

زندگی

زندگی کا ہر لمحہ گراں مایہ ہے۔ ان لمحات کو ضائع نہ کیجیئے۔ کیونکہ ان میں کچھ لمحات ایسے بھی ہوا کرتے ہیں، جو آپ کی زندگی کو نئے انسانی روپ میں بدل دینگے۔

ہم اپنے ایک ہفتہ کے لمحات کا محاسبہ لیں تو ہم میں سے زیادہ تر یہ دیکھ کر چونک پڑیں گے کہ انہوں نے اپنا کتنا وقت برباد کیا۔ وقت برباد کرنا گویا زندگی برباد کرنا ہے۔ کیونکہ وقت ہی زندگی کا پیمانہ ہے اور ہم کو بھی زندگی ایک وقتِ معین ہی کے لئے ملی ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اپنی زندگی کو جس طرح گذارنی ہو ویسے گذارتے ہوں، کیونکہ زندگی کو خوشگوار گذارنا کمال کی بات ہے۔ اگر لوگ صحیح معنوں میں زندگی گذاریں تو اُن کی زندگی موتیوں سے معمور ہو جائیگی۔ ایک مشہور مغربی مفکر نے اپنی کتاب "ارنالڈ بنیٹ" میں لکھا ہے کہ کیا تمہیں زندگی پیاری ہے؟ اگر پیاری ہے تو تم وقت کو برباد نہ کرو۔ کیونکہ زندگی وقت ہی سے ہے اور عقلمند وہی بنا جس نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا رکھا ہو اور جس کا ایک لمحہ بھی سو فیصد کام میں مصروف رہتا ہو اور وہی شخص اپنے وقت کو کام میں لانا سیکھ لیا اور دولت کا مالک بن گیا۔

بیشک کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جب انسان وقت سے بے وفائی برتے تو وقت بھی اس کے ساتھ بے رخی برتے گا جو وقت کو برباد کرے، وقت اس کو برباد کردیگا۔

زندگی میں خوشی کے اوقات کا شمار کرنا محال ہے۔ ایک مشہور مغربی مفکر نے کہا تھا کہ تم اپنے آنسوؤں کو گن سکتے ہو لیکن اپنے قہقہوں کو گن نہیں سکتے۔ اگر کوئی انسان اس کو

اپنائے تو وہ مسرت کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ بایں طور کہ دو باتوں کو سامنے رکھے۔ اول خواہشات کا خیال رکھنا ثانیہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ اس طریقے سے کہ ان کو احساس نہ ہو کہ ہم کچھ اور چاہتے ہیں کیونکہ زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے' اور موت اس کا راستہ لمبا اوقات ہم کو ایک منٹ کئی ہزار سال سے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔

اچھی کتابوں کا مطالعہ

کتاب تنہائی کی بہترین رفیق ہے۔ اس کے قرب سے ہمیں بے حد فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور ہمیشہ اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا ذہن میں اچھے خیالات و تفکرات جنم لیتے ہیں اور فکر میں وسعتِ نظری اور فہم کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ صرف کتابیں پڑھنے کے لئے تو پڑھتے ہیں لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ زندگی کی کٹھن منزل سے ہمکنار ہونے کے لئے روشنی حاصل نہیں کرتے اس لئے آپ کا بہت سا وقت جو فضول و ضائع ہو جاتا ہے اس میں آپ کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں تو نہ صرف وقت ضائع ہونے سے بچیں گے بلکہ آپکے ذہن میں موتیاں' فہم و بصیرت کے موتیاں بھر جائیں گے۔ مطالعہ میں جتنا غور و فکر اور یکسوئی سے کام لیں تو اتنا ہی معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ تھوڑا تھوڑا ہی سہی لیکن سمجھ کے روزانہ پڑھیں۔ یہ ایک دن کا تھوڑا سا حصہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ ع

قطرہ قطرہ می شود دریا

خوشگوار زندگی

اگر زندگی کو اس کے لوازمات کے ساتھ گذاریں تو اس میں احساس اور اطمینان و سکون کا اضافہ ہوتا ہے اور جوں جوں انسان زندگی کے مراحل طے کرتا جاتا ہے اسی قدر تجربہ و فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک مشہور مغربی مفکر' سی جی ڈوکان نے لکھا ہے کہ میں اپنی زندگی میں بہت سے امیر و باوقار اور کامیاب لوگوں سے ملا ہوں لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ ان میں سے صرف گنتی کے چند لوگوں نے اپنی زندگی کو صحیح معنوں میں خوشحالی کے ساتھ گذاری ہو اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہو کیونکہ ان کی ناکامی کا راز اپنی نامکمل' اور ادھوری شخصیت میں مضمر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے خود کو نبھا کرنا نہیں جانتے' اس لئے منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتے۔

جب زندگی کو بدصورت بنانے والی باتوں سے زندگی کا ذہن بچا کر زندگی کو حسن و خوبصورتی بخشنے کی کوشش کی ہے تو زندگی خود کو خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے کیونکہ خوشگوار زندگی ایک ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان سکھ و چین کی سانس لیتا ہے۔

ڈاکٹر ارنالڈ کا قول ہے کہ اگر تم طویل عمر کی خواہش رکھتے ہو' زندگی میں خوب ہنسا کرو' امید ہے کہ عمر دراز پاؤ گے۔ اسی بنا پہ ڈاکٹر ہیبون لیڈ نے

بقیہ بر صفحہ ۹۶

فرمودات لقمان حکیم

از
خواجہ قطب الدین بسوری
متعلم دار العلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب ویلور

۱) دنیا کی مصیبتوں پر صبر کر کہ وہ سہل ہو جائیں، اور موت کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

۲) میں نے ادب بے ادبوں سے سیکھا اور جو کام پسند نہ آئے ان سے اجتناب کیا۔ میں نے حکمت اندھوں سے سیکھی کیونکہ جب تک وہ جگہ کو سمجھ نہیں لیتے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔

۳) یہ غلط ہے کہ برائی کا ازالہ برائی سے ہوتا ہے نیکی سے بھی ہوتا ہے جیسے آگ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔

۴) اے بیٹے، تو حلال کمائی کے ذریعہ تنگدستی سے بچ، کیونکہ جو محتاج ہوتا ہے، اس پر تین آفتیں آتی ہیں۔ ایک دین میں ضعف، دوسرا عقل میں کمی۔ تیسرا مروّت کا ختم ہو جانا

۵) طلوع و غروب کے وقت سونا اچھا نہیں۔

۶) لوگوں سے اس درجہ بے تکلف نہ بن کہ وہ ڈھیٹ ہو جائیں۔

۷) خدا اور موت کو کبھی نہ بھول۔ اپنی نیکی اور دوسروں کی بدی بھول جا۔

۸) جو بات تو دشمن سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے دوست سے بھی پوشیدہ رکھ مبادا کسی روز وہ بھی دشمن ہو جائے۔

۹) اگر لوگ تمہاری ایسی تعریف کریں جس کے تم مستحق نہیں ہو، اس سے تم مغرور نہ ہو۔ جاہلوں کے کہنے سے ٹھیکری سونا نہیں بن جاتی۔

۱۰) غریبوں کی خدمت کرنے والا (اجر اور ثواب میں) صائم النہار اور قائم اللیل کے برابر ہے۔

۱۱) تم زمین والوں پہ مہربانی کرو، آسمان والا تم پہ مہربان ہوگا۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پہ
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پہ (حالی)

رسالۂ اللطیف کے پچھلے شمارے میں حقیقی اور رسمی علم کے عنوان پر گفتگو کی گئی تھی، لیکن وہ نامکمل تھی۔ اس شمارہ میں اسی بحث کی تکمیل مقصود ہے۔

گذشتہ بحث میں ہم نے یہ کہا تھا کہ حقیقی علم ایک نور ہے، جو خدا کی طرف سے قلب میں القا کیا جاتا ہے زبان سے الفاظ و کلمات کا ادا کر دینا یہ صرف ظاہری و رسمی علم ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا،

العلم نور یجعلہ اللہ حیث یشاء ولیس بکثرۃ الروایۃ حقیقت اور رسم میں بڑا فرق ہے۔ رسمی علم چند درسی کتابوں میں محدود رہتا ہے۔ اگر کسی درس نظامیہ کے فارغ التحصیل کے سامنے کوئی جدید نصاب پیش کیا جائے تو اُسے حل کرنے اور سمجھنے میں اسے از سر نو محنت و مطالعہ کی ضرورت ہوگی اور اگر کسی درس عالیہ کے فارغ التحصیل کو درس نظامیہ کا نصاب دے دیا جائے تو اس کو بھی یہی مصیبت پیش آئے گی، یہی حال ہر علم و فن کے عالم و فاضل کا ہے، وجہ یہ ہے کہ ان کا علم چند کتابوں تک محدود ہے۔ اس لئے ہر جدید نصاب ان کے لئے مصیبت ہے۔

لیکن حقیقی علم میں یہ بات نہیں۔ جب قلب انسانی مہبطِ انوارِ الٰہی ہوتا ہے تو حقائق اشیاء سب اس کے سامنے منکشف ہو جاتے ہیں کسی قسم کا خفاء یا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ ملاحسن نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے العلم نور یتجلی بہ الامر الواقعی میں نے اس مسئلہ کی وضاحت کیلئے اقوال علماء اور اہل اللہ کے حالات و واقعات سے چند مثالیں پیش کی تھی (پچھلے رسالہ میں) اس موقعہ پر ان سب باتوں کا اعادہ مزید طوالت کا باعث ہے۔ اس لئے ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔ چونکہ گفتگو حقیقی علم سے متعلق تھی لہٰذا اس سلسلہ میں ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے تمام زندگی خربوزہ اس خیال سے نہیں کھایا کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح

کھایا ہے اور دوسری طرف اپنے متعلق یوں فرماتے تھے
کہ سبحانی ما اعظم شانی، جس سے اپنی تقدیس و
تنزیہہ ذات کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ یہ کلمات
ذات باری تعالیٰ ہی کے لئے شایان شان ہیں، تو حضرت
بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف اپنے کو بڑھایا
اور اس درجہ بڑھا دیا کہ اپنی ذات کو ذات باریتعالےٰ
کا ہمسر کر دیا اور دوسری طرف اتباع و اطاعت کا یہ حال
کہ تمام زندگی خربوزہ نہیں کھایا۔ کیونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ
حضور علیہ السلام نے خربوزہ کاٹ کر کھایا تھا یا توڑ کر
تناول فرمایا تھا۔ اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کا یہ حال کہ باوجود اپنی عظمت و جلالت شان کے
فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر روز ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں
ستر کا لفظ تحدید یا تعیین کے لئے نہیں ہے بلکہ مقصود
کثرت کا بیان ہے یعنی کثرت کے ساتھ استغفار کرتا ہوں۔
تو منشاء سوال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہمہ
عظمت و جلالت اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر رہے ہیں۔
اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بلندی مرتبت
اور رفعت شان کا اظہار کر رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ حضرت بایزید کا درجہ بلند ہے حالانکہ ایک امتی
پیغمبر سے کسی حال میں بھی افضل نہیں ہو سکتا یہ عقیدہ کا
مسئلہ ہے تو آخر اس مسئلہ کا کیا حل ہے۔ مولانا رومؒ نے
فرمایا کہ حضرت بایزید اگرچہ بہت بڑے پایہ کے بزرگ
تھے لیکن مقام ولایت میں ایک خاص درجہ پر ان کی
ترقی موقوف ہو گئی تھی۔ تو جس بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پہ
وہ فائز تھے اس کے لحاظ سے تمام دوسرے مدارج و مراتب
ان کی نظر میں پست اور کمتر تھے اس لئے اپنے مرتبہ کی عظمت
کے اثر سے ان کی زبان سے بے ساختہ ایسے الفاظ نکل جاتے
تھے جو موہم تنزیہ و تقدیس ہوں۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کا تقرب و ترقی کسی خاص درجہ پہ موقوف نہیں تھی،
بلکہ ہر لمحہ اور ہر ساعت آپکے درجات و مراتب میں اضافہ
ہوتا جا رہا تھا اس لئے جیسے جیسے آپ بلند سے بلند تر مرتبہ
پہ فائز ہوتے ہر پچھلے مرتبہ سے استغفار کرتے تھے تو اس
طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی غیر محدود ہو گئی، اور
دوسرے اکابر اہل اللہ کی ترقی محدود رہی۔ لہٰذا ایک محدود
شئی کو جو نسبت غیر محدود شئے سے ہو سکتی ہے وہی نسبت
دوسرے حضرات کے علوم کو حضور علیہ السلام کے علم سے
ہے۔ واضح رہے کہ میں نے یہاں غیر محدود کا لفظ تقابل
کے اعتبار سے کہا ہے۔ ورنہ بندہ کی ہر صفت محدود ہی ہوتی
ہے۔ غیر محدود صرف حق تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ دیکھئے یہ
ہے علم حقیقی کی شان جو صرف کتابی علم پہ موقوف نہیں ہے
بلکہ یہ ایسا نور ہے جس کے سامنے ہر حقیقت منکشف ہو جاتی
ہے۔ اسی کے مناسب ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ امام
اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ما عرفناک حق
معرفتک یعنی حق تعالیٰ کا جو حق معرفت ہے وہ مجھے حاصل نہیں
ہے۔ ظاہر ہے کہ امام صاحب کا قول ارشاد نبوی صلی اللہ
علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

امام صاحب اپنے علو مرتبت کا ادعا کر رہے ہے حالانکہ یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ اس اعتراض کا جواب بعض کاملین کی طرف سے دو طرح پر دیا گیا ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ ایک حق معرفت ہے ذات باری تعالیٰ کی عظمت شان کے اعتبار سے، اور ایک حق معرفت ہے عارف کی استعداد کے اعتبار سے، تو حضور علیہ السلام کے ارشاد میں جو حق معرفت کی نفی ہے، وہ بایں معنی ہے کہ واقع اور نفس الامر میں جو معرفت کا حق ہے وہ حاصل نہیں ہے اور امام صاحب کے قول میں جو حق معرفت کا اثبات ہے، وہ اس لحاظ سے ہے کہ ہماری استعداد کا جس قدر مقتضا ہے وہ حاصل ہے۔ لہٰذا دونوں قول میں کوئی تعارض نہ رہا۔ نفی اور حیثیت سے ہے اور اثبات دوسری جہت سے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ امام صاحب کے قول میں کہ حق معرفت مجھے حاصل ہے باری تعالیٰ کا حق معرفت یہی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی پوری معرفت نہیں ہو سکتی تو عدم معرفت کا ادراک یہی اس کا حق معرفت ہے، لہٰذا جو مطلب حضور علیہ السلام کے ارشاد بہ عنوان نفی کا ہے وہی مقصد امام صاحب کے قول بہ عنوان اثبات کا ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہے۔ دونوں میں معنیً کوئی اختلاف و تعارض نہیں۔ اسی طرح اور بھی اقوال وارشادات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں ظاہری علم اس کے حل سے عاجز رہتا ہے۔ بلکہ یہ تو خیریت ہوی کہ یہ حضرات موجودہ دور میں نہ ہوئے ورنہ تکفیر و تضلیل کی زد سے یہ بھی نہ بچتے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے العلم علمان علم علی اللسان فذلك حجة الله تعالیٰ علی خلقه وعلم فی القلب فذلك العلم النافع یعنی علم دو طرح کا ہے۔ ایک علم محض لسانی ہے اور وہ خدا کے روبرو بندہ کے مقابلہ میں حجت ہوگا۔ یہی علم غیر نافع ہے جس سے حضور علیہ السلام نے پناہ مانگی ہے اللهم انی اعوذ بك من علم لا ینفع دوسرا علم قلبی ہے اور یہی علم نافع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان اخوف ما اخاف علی هذه الامة المنافق العلیم قالوا وکیف یکون منافقا علیما قال علیم اللسان جاهل القلب والعمل یعنی اس امت کے لئے سب سے زیادہ باعث فتنہ وہ شخص ہوگا جو زبان کا تو عالم ہو لیکن قلب اور عمل کا جاہل ہو جس کو آپ نے منافق علیم کہا ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ علم دو طرح کا ہے۔ ایک علم لسانی ظاہری، دوسرا علم قلبی نورانی۔ تو اب یہ عرض کروں گا کہ اس علم قلبی کے (کہ جو علم نافع اور نور الٰہی ہے) حصول کے شرائط و آداب کیا ہیں۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ تمام اخلاق رذیلہ اور اوصاف دنیئہ مثلاً غیظ و غضب، کینہ و حسد، تکبر و ترفع، خود بینی و خود پسندی، حرص و ہوس، بخل و خساست، شہوت و نفس پرستی، غرض اس طرح جتنے بھی اوصاف قبیحہ ہو سکتے ہیں، ان تمام سے پوری طرح قلب کی تطہیر ضروری

ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اوصاف مذکورہ کتے کی خصوصیات
سے ہیں۔ پس گویا یہ تمام صفات کتے کی شکل معنوی ہیں۔
اور اس علم کا فیضان قلب میں فرشتے کے ذریعہ ہوتا ہے۔
جیساکہ آیت کریمہ اس پر شاہد ہے ماکان لبشر ان
یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل
رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء فرشتے مقدس و
مطہر ہیں علم نور الٰہی ہے تو اس قلب میں جہاں تمام معنوی
کتے بھرے ہوں فرشتوں کا گذر کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر
اس قلب میں مقدس علم کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے جیسا
کہ حدیث شریف میں آیا ہے لا تدخل الملائکۃ
بیتا فیہ کلب، علمائے محققین نے اس حدیث کی
دو طرح سے شرح کی ہے۔ ایک مفہوم تو بالکل ظاہر ہے
یعنی جس گھر میں کتا ہو اس میں فرشتے نہیں جاتے (یعنی
رحمت کے فرشتے) دوسرا مطلب حدیث کا وہی ہے جو
پہلے ذکر کیا گیا یعنی جہاں (معنوی) کتے موجود ہوں وہاں
فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

اوصاف مذکورہ کی شناعت و قباحت پر تفصیلی
بحث کا موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے
کہ یہ تمام امور قلب و روح کے امراض ہیں تو جب تک ان
امراض کا ازالہ نہ ہوگا قلب و روح کی درستی و صفائی نہیں
ہو سکتی اور جب قلب فاسد ہوگا تو اس کے کسی عمل سے
بھی صلاح و خیر کی امید رکھنا فضول و عبث ہے مختلف
اعمال مثلاً تحصیل علم، نماز، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ
یہ سب اعمال بہت اچھے ہیں مگر جب ان افعال میں کوئی غرض
فاسد شامل ہو جائے مثلاً تحصیل علم، طلب دنیا کے لئے ہو
اسی طرح دوسرے اعمال نام و نمود، شہرت عزت کیلئے ہوں
تو سب بیکار ہیں، بلکہ یہی اعمال عذاب و سزا کا سبب ہونگے
جیساکہ ایک طویل حدیث اسی مضمون کی حضرت ابوہریرہ
رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے
پہلے حساب و کتاب کیلئے علماء و شہداء، اور اغنیاء کو خدا کے
حضور پیش کیا جائے گا۔ ان کے بیانات اور کارناموں
کو سن کر کہا جائے گا کہ تم نے یہ جو کچھ کیا غرض فاسد کے
تحت کیا۔ صرف اپنے نام و نمود عزت و شہرت کے حصول
کے لئے کیا۔ لہٰذا اب ہم سے کسی مزید انعام و اکرام کی توقع
رکھنا فضول ہے اور سب کو دوزخ میں بھیجدیا جائے گا۔
یہ انجام بد اسی لئے دیکھنا پڑا کہ قلب فاسد تھا اس لئے
اس کے جذبات و محرکات سب فاسد تھے پس البناء علی
الفاسد فاسد کے مطابق جو اقوال و افعال اس پر مرتب
ہوئے وہ سب فاسد تھے۔

اس ضمن میں مدرسۂ نظامیہ بغداد کے ایک طالب علم
کی حکایت ذکر کردوں تو مقصود کی بخوبی وضاحت ہو جائیگی
چونکہ اس زمانہ میں قضاء افتاء وغیرہ کے عہدے علماء ہی
کو دئے جاتے تھے تو جس کا باپ قاضی یا مفتی ہوتا تھا اس
کا بیٹا بھی اس عہدہ کا مستحق سمجھا جاتا تھا خواہ وہ اہل ہو
یا نا اہل ہو، جاہل ہو یا عالم ہو۔ اس لئے بادشاہ نے
اس مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد اس غرض سے رکھی کہ جو شخص

اس مدرسہ سے پڑھ کر کامیابی حاصل کرلیگا اسی کو یہ عہدے
تفویض کئے جائیں گے تاکہ جہلا کو اس عہدہ کی طلب درخواست
کا حوصلہ نہ ہو لیکن اس احتیاط و پیش بندی کے باوجود
جب اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تو تمام علماء بخارا میں صفِ
ماتم بچھ گئی کہ آج کی تاریخ سے علم دین دنیا کیلئے پڑھا جائے
گا۔ ایک دن بادشاہ اپنا شاہی لباس تبدیل کرکے معمولی
حالت میں طلباء کے خیالات کی آزمائش کے لئے مدرسہ
تشریف لائے اور ایک طالب علم سے پوچھا کہ آپ کس لئے پڑھتے
ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ میرا باپ قاضی
ہے۔ اگر میں پڑھ لوں گا تو میں بھی قاضی ہو جاؤں گا۔ پھر دوسرے
سے پوچھا اس نے کہا کہ میرا باپ مفتی ہے۔ میں مفتی بننے کے
لئے پڑھتا ہوں۔ غرض بادشاہ نے جس سے بھی سوال کیا اس نے
دنیا ہی کی کوئی غرض بتائی کسی نے کہا میں خطیب ہو جاؤں۔
کسی نے مناظرِ اعظم بننے کا شوق ظاہر کیا وغیرہ وغیرہ۔
خلاصہ یہ کہ یہ بندگانِ ہوا و ہوس حرص دنیا میں مبتلا تھے
کسی کا مقصد نیک اور خالص نہیں تھا۔ اتفاقاً بادشاہ کی
نظر گوشہ میں ایک طالب العلم پر پڑی جو خستگی کی حالت
میں بہت معمولی کپڑا پہنے کتاب دیکھ رہے تھے، بادشاہ
نے ان سے تحصیل علم کی غرض دریافت کی تو انہوں نے
کہا میں اس لئے پڑھتا ہوں تاکہ اپنے خالق و مالک کے احکام
اوامر و نواہی، مرضیات و نامرضیات کو جانوں اور اس کے
احکام پہ عمل کرکے اسکی رضا و خوشنودی حاصل کروں۔
بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور ظاہر کیا کہ میں
سلطان ہوں۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس مدرسہ کو
ختم کردوں مگر صرف تمہاری وجہ سے مدرسہ کو باقی
رکھتا ہوں کیونکہ دوسرے تمام لوگ دنیا طلبی کے لئے
علم حاصل کر رہے ہیں اور تم خدا طلبی کے لئے کوشش
کر رہے ہو اور یہی تحصیل علم کا مقصد ہے۔ یہ وہی طالب علم
تھے جن کو دنیا آج امام غزالیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔
آپ کا علمی مرتبہ، فضائل و کمالات ساری دنیا کے
نزدیک مسلّم و متفق علیہ ہے۔ اس کے بیان کی حاجت
نہیں یہ برکت تھی آپکے اخلاص، للّٰہیت، جذبۂ صادق
اور نیت خیر کی جس سے آپ مقبول بارگاہ ہوئے۔

چونکہ آج ہماری نیتیں درست نہیں ہیں تحصیل علم
کا مقصد ہم نے دنیوی اغراض و مصالح کو قرار دے
رکھا ہے۔ اس لئے اس کے تمام ثمرات و برکات سے محروم
ہیں۔ شر و فتنہ، فساد و ہنگامہ، شقاق و نفاق ہر طرف
رونما ہے۔ ملتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ اعدائے
دین سروں پہ مسلط ہیں۔ لیکن ہماری غفلت و مدہوشی، جہالت
و تعصب کا حال بدستور قائم ہے۔ آج خود ہندوستان میں
مذہبی و سیاسی لاتعداد جماعتیں ہیں اور سب باہم دست
بگریباں ہیں۔ کوئی جماعت کسی دوسری جماعت کے ساتھ
مصالحت و اتفاق کے لئے آمادہ نہیں۔ غیر تو غیر خود ایک
مسلمان دوسرے مسلمان کو زک و شکست دینے کیلئے تیار ہے۔
مختصر یہ کہ مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کی داستان بہت
طویل ہے۔ جگہ جگہ ذرا سی بات پہ پارٹی بندی اور مقدمہ

بازی یہ تو معمولی کھیل ہوگیا ہے۔ لیڈری، قیادت و صدارت کا نشہ ہر ایک پر سوار ہے۔ قوم کی کشتی مصائب و آلام کے طوفان میں تھپیڑے کھا رہی ہے مگر اُسے ساحل سے لگانے والا کوئی نہیں، غیرت و احساس سب ختم ہو چکا ہے۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات تو یہی ہے کہ اپنے ضیاع و نقصان کا احساس بھی ختم ہو چکا ہے ایسی حالت میں تدارک و تلافی کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے قلب کی بیماریاں لا علاج حد تک پہنچ گئی ہیں۔ اس لئے سوائے شر و فتنہ کے خیر و صلاح رشد و فلاح کی کوئی امید نہیں بمصداق آیتِ کریمہ واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون الا انھم ھم المفسدون ولٰکن لا یشعرون گویا قلب کی حالت ایسی مسخ ہو چکی ہے کہ اپنے فعلِ افساد ہی کو فعلِ اصلاح سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم ان کے مفسد و فتنہ پرداز ہونیکی شہادت دے رہا ہے۔ ہمارے نام نہاد علماء کی فتنہ گری و فتنہ پردازی مکمل رنگ لا کر رہے گی اور جو کچھ قوم و ملت کا رہا سہا سرمایہ عز و افتخار ہے، اسے بھی خاک میں ملا کر رہے گی۔ شاید ڈاکٹر اقبال نے ایسے ہی مسلمانوں کے لئے کہا تھا ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

گذشتہ زمانے میں علمِ دین کے تحصیل کی ہر کس و ناکس کو اجازت نہیں تھی بلکہ اساتذہ روزگار اپنے فہم و بصیرت سے لائق و صالح افراد کو منتخب کر لیتے تھے جن میں حبِ دنیا اور زر طلبی کا کوئی جذبہ نہ ہوتا اور پوری توجہ، شفقت و عنایت سے ان کی تعلیم و تربیت کرتے تھے جس کا خاطر خواہ ثمرہ بر آمد ہوتا تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔ اب تو عموماً قوم کے صالح اور لائق افراد مدارسِ دینیہ کا رخ بھی نہیں کرتے بلکہ عام طور سے سب سے زیادہ نااہل اور کم ظرف لوگ مدارسِ عربیہ کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں جنکی مثال بنجر زمین کی ہوتی ہے جس میں کاشت یا فصل کی امید نہیں ہوتی۔

زمینِ شور سنبل بر نیارد
درو تخمِ عمل ضائع مگرداں

تو ان لوگوں میں فطری صلاحیت و استعداد تو پہلے ہی سے مفقود ہوتی ہے پھر تھوڑا بہت کسی مدرسہ میں رہ کر جو علم سیکھ لیتے ہیں اسپر کریلا اور نیم چڑھا کی مثل صادق آتی ہے۔ کہ کریلا تو کڑوا ہوتا ہی ہے، جب نیم کے درخت پر لگا دیا گیا تو اس کی کڑواہٹ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ کیا حال ہوگا۔

اگر ان کی تعلیم کا ضرر و نقصان انہیں کی ذات تک محدود رہتا تو زیادہ فکر کی بات نہیں تھی مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس کا ضرر متعدی ہے۔ اسکی زد میں پوری قوم آ جاتی ہے۔ جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے اسی لئے فداہ امی وابی محمد عربی

بموجِ تبسم

انسان دنیا کی ہماہمی میں اُلجھ کر سکون قلب کی خاطر کبھی سیر و تفریح کی جانب مائل ہوتا ہے تو کبھی انہی پریشانیوں کو دُور کرنے کے لئے ہنسی مذاق کا سہارا لیتا ہے۔ فطرت انسانی کے اس جذبہ سے دنیا کے اکثر افراد اتفاق رکھتے ہیں اسلئے آیئے، پڑھئے اور کچھ مسکرائیے۔

(۱) **حاکم**: قسم کھاؤ کہ تم نے چوری نہیں کی۔

ملزم جناب اس وقت میرا پیٹ بھرا ہوا ہے میں کچھ کھا نہیں سکتا۔

۲)۔ **ماں** (بیٹے سے) بیٹا بازار سے دس پیسے کا گرم مصالحہ لے آؤ۔

بیٹا: معاف کرنا امی! میرا ہاتھ جل جائے گا۔

۳) **استاد** کل کی انگریزی کیا ہے؟

شاگرد۔ ٹومارو

استاد۔ شاباش اور پرسوں کی؟

شاگرد۔ "ٹومارو" پر ایک اور مارو

۴) **رزاق**۔ تم کیسے کہتے ہو کہ گھانس کھانے سے آنکھیں اچھی رہتی ہیں۔

مشتاق کیونکہ میں نے آج تک گھوڑے گدھے کو چشمہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

۵) **ڈاکٹر** (لیاقت سے) کیوں صاحبزادے تمکو کہاں تکلیف ہوتی ہے؟

(از)

سید مشتاق احمد سڈلگوڈی (متعلم دار العلوم لطیفیہ)
مکان حضرت قطبؒ ویلور

لیاقت: ڈاکٹر صاحب! یہاں نہیں، اسکول میں۔

۶) اپنے چھ سالہ بچے کے جھوٹ بولنے پر ناراض ہوتے ہوئے باپ نے کہا "جب میں تمہاری عمر کا تھا تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں تھا۔

بچہ۔ لیکن ابا! پھر آپ نے کس عمر سے جھوٹ بولنا شروع کیا۔

۷) ایک کنجوس اٹھنی نگل گیا۔ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر موجود نہ تھا اسلئے سب کو انتظار کرنا پڑا اُسے بےچین دیکھ کر اسکے ایک دوست نے کہا گھبراؤ نہیں، ڈاکٹر کے آتے ہی تمہاری تکلیف دُور ہو جائیگی۔

کنجوس یہ سب ٹھیک ہے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ اٹھنی مجھے مل جائے گی یا ہسپتال والے ہڑپ کرلیں گے۔

۸) ایک صاحب کسی دعوت میں گئے۔ اتفاق سے پیچھے پیچھے ایک کتا بھی چلا آرہا تھا۔ صاحب خانہ کے ملازم نے کہا، جناب یہاں کتے لانے کی اجازت نہیں ہے۔

انہوں نے کہا یہ کتا میرا نہیں ہے۔

نوکر لیکن آپ ہی کے پیچھے تو آرہا ہے۔

صاحب جی۔ میرے پیچھے تو آپ بھی آرہے ہیں۔

۹) ایک صاحب (بال کٹواتے ہوئے) کیا تم نے کبھی گدھے کے سر کے بال کاٹے ہیں؟

حجام جی نہیں! آج پہلا اتفاق ہے۔

۱۰) **باپ** (بیٹے سے) بیٹا تم نے جمعہ کی نماز کب پڑھی تھی؟

بیٹا۔ شاید منگل کا دن ہوگا۔

ایک دلچسپ مکالمہ

از
حافظ محمد اسمٰعیل وانمباڑی
متعلم دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت
قطب ویلور قدس سرہٗ

عاقل ۔۔۔ و ۔۔۔ اسماعیل

عاقل! آداب عرض ہے اے دوست

اسمٰعیل۔ آداب۔ آداب، ارے آپ عاقل صاحب تشریف لائیے بنگلور سے کب آنا ہوا، آپ تو بنگلور ایسے گئے کہ وہاں کے دلفریب نظاروں میں کھو کر ہم کو بالکل ہی بھول گئے۔

عاقل خدا کے لئے مجھے شرمندہ نہ کرو میرے دوست! میں آپ کو بھلا نہیں بیٹھا بلکہ دفتر کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ خط ارسال کرنے کی فرصت بھی بمشکل نکل آتی ہے کسی نے سچ ہی کہا ہے' اچھا دوست قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔ بنگلور جب سے گیا ہوں وہاں مجھے کوئی ایسا ساتھی نہ ملا جو میرے سوالات کے جوابات دیکر میرے معلومات کا اضافہ کرتا۔ آپ ہی ایک ایسے تھے کہ میرے ہر سوال کا جواب اطمینان بخش دیتے تھے۔

اسمٰعیل آپ سفر کے تھکے ماندے ہیں۔ پہلے تھوڑی دیر آرام کر لیجئے پھر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

عاقل نہیں میرے دوست مجھے بالکل فرصت نہیں ہے آج ہی شام کی گاڑی سے مجھے فوری واپس ہونا ہے آپ میرے آرام کی بالکل چنتا نہ کیجئے۔ میرے سوالات کے جوابات دیکر رخصت کردیں تو عین نوازش ہوگی' کیونکہ مجھے دوسرے اہم کام بھی ہیں۔

اسمٰعیل عاقل صاحب! آپ کی وجہ سے میرے معلومات میں ہمیشہ تازگی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے تعلیمی دور کی ساری زندگی یاد آگئی۔ اچھا تو خیر آپ شوق سے سوالات کیجئے، ہوسکے تو جوابات معقول دوں گا۔

عاقل۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیے کہ دنیا میں سب سے اوّلین کاتب کون تھا؟

اسمٰعیل دیکھئے جناب! دنیا میں سب سے اولین کاتب تو سیدنا موسیٰ کلیم اللہؑ تھے۔

عاقل اچھا جناب! اسلامی عہد میں سب سے پہلے لائبریری کس نے ایجاد کی؟

اسمٰعیل اسلامی عہد میں لائبریری کے ایجاد کرنے والے تو حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔

عاقل لیکن مسجد نبوی میں چراغ سب سے پہلے کس نے روشن کیا؟

اسمٰعیل مسجد نبوی میں چراغ روشن کرنے والے حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ ہیں۔

عاقل مکہ مکرمہ میں لکھنے پڑھنے کی ابتدا کس نے کی تھی؟

اسمٰعیل دیکھئے صاحب! مکہ مکرمہ میں لکھنے پڑھنے کی ابتدا حرب بن امیہ نے کی تھی۔

عاقل، ہاں تو جناب! سب سے پہلے دینی طالب العلم کون تھے؟
اسمٰعیل، وہ تو ابن عباسؓ تھے۔
عاقل میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ دنیا میں سب سے بڑا محل کہاں ہے۔
اسمٰعیل جناب من! دنیا میں سب سے بڑا محل رنکیس روم کا ہے۔
عاقل۔ میرے محترم! دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کونسی ہے۔
اسمٰعیل۔ میرے مکرم دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بلیتھیو نیشنل نامی ہے۔
عاقل۔ ذرا یہ بھی تو بتائیے کہ ہمارا ہندوستان جمہوری ملک کب بنا ہے۔
اسمٰعیل ہمارا ہندوستان ۲۶ رجنوری ۱۹۵۱ء میں جمہوری ملک بنا۔
عاقل میرے ہمدم، دنیا میں سب سے خوبصورت شہر کونسا ہے اور کہاں ہے؟
اسمٰعیل۔ میرے دوست دنیا کا سب سے خوبصورت شہر پیارس ہے، جو فرانس میں واقع ہے۔
عاقل لیکن حضور والا، دنیا کا سب سے بڑا شہر کونسا ہے اور کہاں ہے؟
اسمٰعیل۔ عالیجاہ! دنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو جو جاپان میں واقع ہے۔
عاقل۔ معاف کرنا اسمٰعیل صاحب آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف پہنچی، آپ کا بہت ہی ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت میرے لئے صرف کیا۔
اسمٰعیل۔ کوئی بات نہیں میرے عاقل، شکریہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ اپنوں کا نہیں۔ میری یہی درخواست ہے کہ خدا کے لئے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ ہماری دوستی اور پیار و محبت کے بندھن ٹوٹنے نہ پائیں۔

تمت

مطبوعہ الیکٹرک قومی پریس بنگلور ۱